www.urducouncil.nic.in

نومبر 2021 ، قیمت :- ₹10

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

ایک کلک پر ادب اطفال کا بیش بہا خزانہ

پیارے بچو! آپ کے ذوق کی کتابیں اگر نہیں مل پا رہی ہیں تو مایوس نہ ہوں۔ قومی اردو کونسل کے موبائل ایپ (ekitaab) اور ویب سائٹ (https://www.urducouncil.nic.in/) پر آپ کے لیے بہت سی مفید کتابیں موجود ہیں۔ اسے آپ ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
	مضامین	
داتا گنج بخش	صادق	07
جیک پو کی محنت رنگ لائی	سلمی یوسف حسین	09
اسمارٹ فون کا استعمال اور طلبا کی صحت	ذکی ممتاز	11
ہماری شرارتیں اور چھدا ابا	ندیم راعی مرادآبادی	15
بین الاقوامی یوم تحمل و بردباری	ہما محفوظ الرحمن	18
	میرا بچپن	
بچپن کا شوق اور خوش حالی	رونق جمال	21
	نظمیں	
ممی کیوں بھیجا کھاتی ہے!	عبدالرحیم نشتر	23
ایک ہیں	کوثر صدیقی	24
اچھی بچی	عطیہ پروین	25
بچوں کی دنیا	فیض رتلامی	26
اب کے یوں دیوالی آئے	متین اچل پوری	27
فصل بہاراں	خورشید جمال	27
اردو سے تم خوب پیار کرو	شکیل سہسرامی	28
	کہانیاں	
گھڑی	حلیمہ فردوس	29
تاج کا ہیرا	عاکف سنبھلی	31
عقل مند اندھا	جہانگیر انس	34
ایثار و سخاوت	پرویز احمد یعقوبی	36
خرگوش اور چور	سعدیہ پروین	38
صحبت کا اثر	متین الدین	40
بٹو اور مینو	فیاض احمد	43
سی سی ٹی وی کیمرا	محمد اسلم تنویر	46
محنت	گوہر رفیع شاذ	48
	سائنس نامہ	
میں خلیہ ہوں	رفیع الدین ناصر	51
	بچوں کا کتب خانہ	
نشان راہ/ نقی احمد ندوی	حقانی القاسمی	54
	زبان شناسی	
محاورے		56
	تاریخی عمارتیں	
سیاحتی مقامات		57
	صحت	
بند گوبھی کے طبی فوائد	عبدالمجید نکرو	58
	کہکشاں	
چمن چمن کے پھول		60
	ننھے فنکار	
انتظار ہے اسکول کھلنے کا	ام ایمن حسیب عالم	61
پینٹنگ		62

بچوں کی دنیا

جلد: 9 شمارہ: 11 نومبر 2021

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: شاہنواز محمد خرم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: 10/ روپے، سالانہ/100 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی - 110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

بچے پوری انسانیت کا مستقبل ہیں۔ اگر اچھے انداز میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے اور ان کی سوچ کو مثبت اور تعمیری بنایا جائے تو وہ آگے چل کر اپنی ذمے داریوں کو بخوبی نبھاتے ہیں اور اپنے ملک وسماج کو ترقی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے ذہنی ارتقا کے لیے سنجیدہ والدین کے ساتھ ساتھ سرکاریں بھی فکر مند ہیں، ان کے لیے سرکاری اسکول و ادارے ہیں اور حکومت کی بہت سی اسکیمیں ہیں جن سے بچے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بچوں کی صحت و تعلیم کے لیے پورا ایک نظام موجود ہے۔ ملک کے چپے چپے پر بچوں کے لیے ایسے اسکول بھی ہیں جن میں مفت تعلیم دی جاتی ہے، بہت سے اسکولوں میں کھانا تک فراہم کیا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے لیے آنگن باڑی کی شکل میں ایک مضبوط و موثر نظام گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال 14/ نومبر کو یوم اطفال کے طور پر منایا جاتا ہے تاکہ لوگ بچوں کے حقوق، نگہداشت اور تعلیم و تربیت کے تعلق سے بیدار ہوں۔

بچو! کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے کیا حقوق ہیں؟ آپ کے بنیادی حقوق میں سے ایک اہم حق یہ ہے کہ سب بچے برابر ہیں۔ لہٰذا کسی بھی بچے کے ساتھ رنگ، نسل، صنف، زبان وغیرہ کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ہی بنیادی ضروریات کی تکمیل بھی آپ کا حق ہے۔ یعنی اگر آپ کی بنیادی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں تو آپ اپنے اس حق کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ ایک اور آپ کا حق یہ بھی ہے کہ آپ تشدد، گالی گلوج اور استحصال سے محفوظ ہوں۔ عزت و شفقت بھی آپ کا حق ہے۔

بچو! یہ جان کر آپ کو بہت خوشی ہوگی کہ کھیلنا بھی آپ کا حق ہے۔ آپ کچھ وقت کھیل سکتے ہیں اور کچھ وقت فری بھی گزار سکتے ہیں تاکہ آپ کے ذہن کو تازگی حاصل ہو جائے۔ اسی کے ساتھ ایک اور خوشی کی بات آپ کے لیے یہ ہے کہ آپ کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع بھی دیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے گھر یا اسکول میں کوئی مناسب رائے رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کی رائے کو سنا جائے گا اور اس پر غور بھی کیا جائے گا۔

یوم اطفال والدین کے لیے بھی سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال، علاج اور تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے پابند عہد ہوں۔ بعض والدین اپنے بچوں سے کم عمری میں ہی کام کرانے لگتے ہیں، اور ان کی تعلیم سے غافل ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل اخلاقاً اور قانوناً درست نہیں ہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

گیا کہ دنیا بھر میں اس دن کو منا کر تعلیم پر پروگرام منعقد کیے جائیں۔

یوم اساتذہ : کے عنوان کے تحت نثری اور شعری تخلیقات ہیں۔جس میں نایاب حسن کا اساتذہ محبت، تربیت اور تعلیم کا جلی عنوان دیا گیا ہے اور اس میں استاد کا احترام، عزت، عظمت، وقار، مرتبہ اور تعظیم کے بارے میں اقوال دیے گئے ہیں۔

پہلا مضمون 'اساتذہ تاریک راہوں کے چراغ' محمد اکرام کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''اساتذہ صرف بچوں کو تعلیم نہیں دیتے بلکہ بہتر تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے خوابوں کو نئی زمین اور نیا آسمان عطا کرتے ہیں۔'' دوسرا مضمون 'میرے استاد سید واجد علی' صبا منیر کا ہے ایک استاد کی عزت کس طرح ہوتی ہے، اس میں بتایا گیا ہے۔اس کے بعد دو نظمیں 'استاد کو سلام' ندیم احمد انصاری ،اور یوم اساتذہ شکیب نائب ابن شمشاد رضی کی ہیں۔

مضامین : کے تحت دو مضامین 'عالمی یوم اوزون' انصار احمد معروفی کا ہے انھوں نے اوزون کے بارے میں نئی معلومات دی ہیں اور اوزون کے بارے میں تفصیل بھی بتائی۔ دوسرا مضمون 'رنگ برنگی چھتری' عادل حیات کا ہے۔ چھتری کے بارے میں اتنی معلومات آج تک کسی نے نہ دیں۔

بچوں کے بڑے ادیب : کے تحت پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور بچوں کا ادب ہے۔ ابرار احمد اجراوی نے خراج عقیدت کے طور پر یہ مضمون لکھا۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد 8 نظمیں ہیں۔

ایک سے ایک سبق آموز کہانیاں ہیں جو بچوں کے لیے سوغات ہیں۔ ترجمہ میں ولیم ہزلٹ کے مضمون طرز حیات کے بیان میں عظیم اقبال کا ہے۔

سائنس نامہ: میں چاند کے بارے میں مختصر مگر اچھی معلومات دی گئی ہیں۔، معلومات، عامہ صحت اطفال، کالی کھانسی ، نغمے فنکار، پینٹنگ وغیرہ جیسے کالم بچوں کے لیے خاصا مواد فراہم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر م ق سلیم ،صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج ،حیدر آباد، تلنگانہ

'بچوں کی دنیا' ستمبر 2021 دستیاب ہوا۔ شیخ عقیل صاحب کا اداریہ جو یوم اساتذہ کی مناسبت سے ہے۔ بہت پسند آیا۔ نایاب حسن کا مضمون بھی اچھا ہے جسے انھوں نے بہت سے ماہرین تعلیم اور دانشوروں کے اقوال سے مضمون کو مزین و مدلل کیا ہے، اچھا ہے۔ محمد اکرام نے بھی یوم اساتذہ سے متعلق مضمون میں استاذ کی عظمت کو واضح کیا ہے۔ صبا منیر، ندیم انصاری شکیب راضی نے نثر و نظم کے وسیلے سے استاد کی محبت کو سلام پیش کیا ہے۔ اس مہینے میں عالمی طور پر یوم اوزون منایا جاتا ہے، آپ نے اس مناسبت سے راقم الحروف کا مضمون۔ عالمی یوم اوزون۔ کو شامل اشاعت کیا۔ بہت بہت شکریہ۔ اس مضمون میں اوزون کی اہمیت کے ساتھ ماحولیاتی آلودگی سے ہونے والے تباہ کن اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رنگ برنگی چھتری کے عنوان سے عادل حیات نے پوری تاریخ پیش کردی ہے۔ معلوماتی مضمون ہے۔ ابرار احمد اجراوی نے مناظر عاشق ہرگانوی کی بچوں کے ادب سے متعلق جو خدمات ہیں ان کا بہترین جائزہ لیا ہے۔ علیم صبا نویدی مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی نظم تاج محل یقیناً تاج محل کی طرح خوبصورت اور چمکدار ہے۔ انس مسرور پرانے قلم کار اور مشہور شاعر ہیں۔ ان کی نظم برکھا رانی پیاری نظم ہے۔ جو بچوں کی پسند اور ان کے معیار کے مطابق ہے۔ رفیق گلاب صاحب بچپن واٹس ایپ گروپ سے مربوط ہیں۔ ان کی نظم۔ میرے پیارے ابو جان۔

مجیب شہزر کی نظم موسم برسات۔ دلکش نظم ہے۔ مگر کاش بھیگتے موسم میں بچوں کو نہاتے اور بارش میں اچھلتے کودتے دکھایا جاتا۔ شاہد جمیل نے گھڑی کا گیت گایا ہے۔ دل کولھاپوری نے بچہ مزدوری کے خلاف اچھی نظم لکھی ہے۔ وارث جمیل نے پیاری گڑیا لکھی ہے۔ مناسب لگی۔ کلیم کی نظم اصلاح کی متقاضی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال برکی پرویز شہر یار کی کہانی بہت اچھی ہے۔ انور مرزا نے آزاد مٹھو کہانی میں بچوں کے معیار اور ان کی دلچسپی کا خاص خیال رکھ کر کہانی لکھی ہے۔ نیز مبین نذیر صاحب نے بھی اچھی کہانی ترتیب دی ہے۔ جو بچوں کو بہت پسند آئے گی۔ دیگر مضامین اور تحریریں لائق مطالعہ اور مفید ہیں۔ تمام قلم کاروں کو مبارک باد۔

انصار احمد معروفی، مدرسہ چشمہ فیض، ادری، ضلع مئو، اتر پردیش

داتا گنج بخش

صادق

اچھے اور برے لوگ دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کے اچھے یا برے کاموں کی وجہ سے ہی ان کے نام بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

اچھے لوگ خود تو اچھے ہوتے ہی ہیں، لیکن وہ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں اور انھیں بھی اچھائیاں سکھاتے ہیں اور اپنی دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسے ہی لوگوں میں سے ایک داتا گنج بخش بھی تھے۔ ان کا نام تو علی بن عثمان تھا۔ لیکن نیک اوصاف کی بنیاد پر داتا گنج بخشی نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کا میدان عمل لاہور تھا۔ جہاں عام لوگوں کے درمیان رہ کر انھوں نے نیکی اور بھلائی کے خیالات کا اظہار کیا اور ان خیالات کو دور دور تک پھیلایا۔ وہ مذہب کے نام پر جاری غلط رسم و رواج کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کو ان کی خرابیاں سمجھا کر انھیں ختم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے صوفیوں میں داتا گنج بخش کا بڑا رتبہ ہے۔

داتا گنج بخش کے زمانے میں سماج میں بہت سی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں، ہر طرف ڈھونگی، جوگیوں، عاملوں، جادو گروں، شعبدہ بازوں، اور دھرم و مذہب کی غلط تاویلیں پیش کرنے والوں کا دور دورہ تھا۔ عام لوگ اپنی بیماریوں اور پریشانیوں وغیرہ سے نجات پانے کے لیے ان کے پاس جاتے تھے اور ان کے چنگل میں پھنس جاتے تھے۔ یہ لوگ پریشانیاں دور کرنے کے نام پر انھیں مختلف طریقوں سے بے وقوف بناتے رہتے تھے اور ان سے روپے پیسے اور قیمتی چیزیں ٹھگتے رہتے تھے۔ ان ڈھونگیوں کی وجہ سے ایسی بہت سی رسمیں اور رواج بن گئے تھے جن کا اصل مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

داتا گنج بخش کو سیر و سفر کا بہت شوق تھا اسی شوق کی وجہ سے انھوں نے عراق شام، بغداد، خراساں، طبرستان، حجاز، آذربائیجان اور ہندوستان وغیرہ کئی ملکوں کے سفر کیے تھے۔ ان کے زمانے میں بسیں، ٹرینیں اور ہوائی جہاز تو ہوتے نہیں تھے۔ پیدل یا گھوڑوں، اونٹوں اور لکڑی کی گاڑیوں اور بحری کشتیوں کے ذریعے سفر کیا جاتا تھا۔

سفر میں مسافروں کو بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ راستوں میں چور، ٹھگ اور راہ زن ہوا کرتے تھے جن کی وجہ سے راہ میں لٹ جانے کا خوف بھی رہتا تھا لیکن فائدے بھی بہت ہوتے تھے۔ سفر میں قدرت کے حسین منظر، دریا، پہاڑ، جنگل، طرح طرح کے درخت چرند و پرند دیکھنے کو ملتے تھے۔ ان منظروں کو دیکھنے سے آنکھوں کو طراوت اور دل کو سکون ملتا تھا۔ خلق خدا سے رابطہ ہوتا تھا۔ تاجر ایک ملک کی چیزیں دوسرے ملکوں میں لے جاتے تھے۔ اسی طرح عالم اپنے علم کو پھیلاتے تھے۔ سفر سے تجارت، علم اور تجربوں میں اضافہ ہوتا تھا۔

داتا گنج بخش نے کئی سفر کیے۔ سفر میں تکلیفیں اور مصیبتیں

بھی برداشت کیں۔ وہ عام لوگوں کے علاوہ اپنے زمانے کے بڑے بڑے فقیروں، صوفیوں اور عالموں سے ملے، ان سے بہت کچھ سیکھا اور لوگوں کو سکھایا۔ کئی ملکوں کی سیر و سیاحت کرنے کے بعد انھیں ہندوستان بہت پسند آیا۔ انھوں نے سوچا کہ یہاں رہ کر وہ نیکی اور بھلائی پھیلانے کا کام خوب کر سکیں گے لہٰذا وہ لاہور میں بس گئے اپنے نیک مقصد کی خاطر انھوں نے اپنی باقی تمام عمر یہیں گزار دی۔ لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی صحبت سے فیض پاتے رہتے تھے۔

داتا گنج بخش درس دیتے تھے۔ اچھی اچھی اور سچی باتیں سکھاتے تھے۔ ماں باپ اور بزرگوں کی عزت کرنا، اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا، رشتے داروں، پڑوسیوں اور سب کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا۔ ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کرنا۔ جھوٹ، فریب اور بغض و حسد سے بچنا۔ خلق کی خدمت اور خدا کی عبادت کرنا۔ یہ ساری ایسی باتیں ہیں جن سے دنیا اور دنیا والوں کا یعنی سب کا بھلا ہوتا ہے۔ داتا گنج بخش عمر بھر ایسی ہی باتیں لوگوں کو سکھاتے اور سمجھاتے رہے۔ انھیں آدمی سے انسان بننے کی ترغیب دیتے رہے۔

زبانی درس و تدریس کے کاموں کے علاوہ داتا گنج بخش نے تصنیفی اور تالیفی کاموں کی طرف بھی توجہ دی اور کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد نو بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام کشف المحجوب ہے۔ داتا گنج بخش شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک کتاب شاعری کی بھی تھی۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب اب کہیں نہیں ملتی۔ اس کا صرف ایک ہی نسخہ ان کے پاس تھا۔ وہ کتاب ان کا ایک جاننے والا پڑھنے کے لیے مانگ کر لے گیا اور پھر کبھی واپس نہیں لایا۔ اس بے ایمان شخص نے اس کتاب کی ترتیب بدل ڈالی اور اس پر سے ان کا نام بھی مٹا دیا۔ یہ بات داتا گنج بخش نے خود اپنی ایک تصنیف میں بیان کی ہے۔

داتا گنج بخش کی لکھی ہوئی سب سے مشہور اور مقبول کتاب 'کشف المحجوب' ہے۔ اس زمانے میں آج کی طرح پرنٹنگ پریس تو تھے نہیں۔ کاغذ بھی بہت مہنگا ہوتا تھا اور آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ پھر بھی داتا گنج بخش کی زندگی میں ہی ان کی اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کی نقلوں پر مشتمل کئی قلمی نسخے تیار کیے جاتے رہے جن میں سے کچھ تو زمانے کی الٹ پھیر میں گم ہو گئے اور کچھ آج بھی دنیا بھر کے بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ داتا گنج بخش نے 'کشف المحجوب' فارسی زبان میں لکھی تھی بعد میں اردو زبان میں بھی اس کے کئی ترجمے ہوئے جو شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

داتا گنج بخش نے اس کتاب میں انسان کے نفس کے بارے میں بھی بہت صراحت سے لکھا ہے: وہ نفس امارہ کو ساری برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ تمام بری باتیں جو گناہوں میں شمار کی جاتی ہیں آدمی کے نفس امارہ سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بری باتیں تکبر، کنجوسی، غصہ، کینہ اور حسد وغیرہ ہیں جو کسی بھی آدمی کو انسانی بلندیوں سے نیچے گرا دیتی ہیں۔ لہٰذا ان سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

مرزا غالب کے زمانے کے ایک شاعر شیخ ابراہیم ذوق نے نفس امارہ سے متعلق اپنے ایک شعر میں داتا گنج بخش کے خیالات کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا

■

Prof.Sadiq
E-28, Jasola Heights
Pocket 9,A, Jasola
New Delhi-110025

سلمیٰ یوسف حسین

جیک پو کی محنت رنگ لائی

آج ہم آپ کو کہانی سنائیں گے جیک پو کی، جس نے اپنی محنت سے ترقی کی اور دنیا میں شہرت حاصل کی۔

جیک پو اپنی ماں کے ساتھ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کی ماں ایک چھوٹی سی بیکری چلاتی تھی۔ جیک پو اسکول سے آنے کے بعد ماں کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا اور بیکری کا کام سیکھتا تھا۔

ایک دن جیک پو کی ماں بیمار ہوگئی۔ جیک پو نے بیکری بند کی۔ بازار سے ماں کے لیے دوا لے آیا۔ پڑوس کے لوگوں سے ماں کی دیکھ بھال کی التجا کی اور اسکول روانہ ہوا۔

اسکول سے واپسی پر اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چلا جارہا تھا۔ اچانک اس کا پیر ایک گڑھے سے ٹکرایا اور وہ گڑھے میں گر گیا۔ گڑھا گہرا تھا اور جیک پو کا اپنے آپ اس سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ آس پاس نہ آدم نہ آدم زاد۔ مدد کے لیے پکارے تو کسے پکارے۔ اسے تو ماں کی خبر لینے گھر، پہنچنے کی جلدی تھی اور اب وہ بے بسی کے عالم میں گڑھے میں سسک رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس کی اس مصیبت میں مدد کرے تاکہ وہ گھر پہنچ جائے۔

پاس ہی ایک ریلوے لائن تھی جہاں دھواں اڑاتا ایک انجن کھڑا تھا۔ جیک پو کو امید کی کرن نظر آئی۔ اچانک انجن کے کالے دھوئیں سے ایک پری زاد نمودار ہوا۔ اس نے کہا میرا نام ٹاٹو ہے۔ آؤ میں تمھاری مدد کردوں۔ جیک پو ٹاٹو کی مدد سے گڑھے سے باہر نکلا اور پری زاد کا شکریہ ادا کیا۔

پری زاد نے جیک پو کو کھانے کی کچھ چیزیں دیں جو بڑی مزے دار تھیں۔ انھیں کھا کر اس کا درد بالکل غائب ہوگیا۔ اس نے پھر ایک بار پری زاد کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ پری زاد پھر دھوئیں میں غائب ہوگیا تھا۔

جیک پو نے گھر کی راہ لی اور گھر پہنچا۔ ماں جیک پو کے دیر سے پہنچنے کی وجہ سے بڑی پریشان تھی۔ جیک پو نے اسے اپنی مشکل اور پری زاد سے ملاقات کا قصہ سنایا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ پری زاد نے اسے مزے دار کھانے کی چیزیں بھی دیں۔ ماں کی فکر دور ہوئی۔ اس نے جیک پو کو گلے سے لگایا اور کہا دوا کھانے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے۔

جب جیک سو کر اٹھا ماں نے اسے بازار بھیجا اور کتاب میں لکھی کھانے کی ترکیبوں کے مطابق سامان منگوایا۔ جیک آدھ گھنٹے میں سارا سامان لے آیا اور ماں نے جھٹ پٹ ان ترکیبوں کے مطابق سامان تیار کرلیا۔ سارا کھانا بے حد مزے دار تھا۔

کچھ عرصے بعد ایک دن جیک پو کی ماں کمرے کی صفائی کررہی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ جیک پو آرام کی نیند سورہا تھا۔ جیک پو کی ماں نے اس کی کتابیں ترتیب سے رکھیں۔ اچانک ان کتابوں میں اس کی نظر ایک کتاب پر پڑی جس پر لکھا تھا 'جیک پو ٹاٹوز' کتاب میں کچھ مزے دار کھانوں کی ترکیبیں درج تھیں۔

جب جیک سو کر اٹھا ماں نے اسے بازار بھیجا اور کتاب میں لکھی کھانے کی ترکیبوں کے مطابق سامان منگوایا۔ جیک آدھ گھنٹے میں سارا سامان لے آیا اور ماں نے جھٹ پٹ ان ترکیبوں کے مطابق سامان تیار کرلیا۔ سارا کھانا بے حد مزے دار تھا۔

جیک نے بتایا اس نے یہ ترکیبیں پری زاد سے حاصل کی ہیں اور اب وہ اس کا اچھا دوست ہے۔

جیک پو نے گاؤں کے میلے میں ماں کا بنایا سامان فروخت کیا اور پیسے کمائے۔ یہ کامیابی کی پہلی منزل تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد جیک نے بیکری کا کام سنبھالا اور اسے آگے بڑھایا۔

ایک دن دور شہر کے راجا کا گزر وہاں سے ہوا۔ وہ بھوک کی شدت سے بے حال تھا۔ لوگوں نے اسے جیک پو کی دکان کا پتہ بتایا۔ راجا وہیں کھانا کھانے پہنچ گیا۔ گو یہاں کا سارا کھانا بیکری میں بنایا گیا تھا لیکن اس قدر مزے دار تھا کہ راجا نے خوش ہوکر جیک پو کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا اور ساتھ ہی اسے انگلستان کا سب سے مشہور بیکر کا خطاب عطا کیا۔

یہ تھی جیک پو کی محنت کی کہانی! بچو! محنت اور لگن انسان کو اعلیٰ مرتبے پر پہنچا دیتی ہے۔ ساتھ ہی ماں کی خدمت کا اجر بھی نرالا ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔

جیک نے ماں کی خدمت کی۔ محنت اور لگن سے کام کیا اور اعلیٰ مرتبے پر پہنچا۔ یاد رکھو صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔

(مئی 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف ملاحظہ فرمائیں)۔

■

Salma Yusuf Husain
E-52, G.F. Sun City
Sector-54
Golf Course Rd.
Gurgaon - 122002 (Haryana)
Mob.: 9910143754

اسمارٹ فون کا استعمال اور طلبا کی صحت

ذکی ممتاز

ڈاکٹر ذکی ممتاز اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کالج آف ٹیچر ایجوکیشن بھوپال میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ 14 سال سے درس و تدریس اور تحقیق وتصنیف کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ بچوں کی نفسیات میں خصوصی دلچسپی اور مہارت ہے۔ اس حوالے سے ان کی بہت سی تحریریں رسائل وجرائد میں شائع ہوچکی ہیں۔ بچوں کی نظمیں، مضامین، ان کی تعلیمی رہنمائی اور مشاورت سے متعلق کئی تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔

اسمارٹ فون اب ہر ایک شخص کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ اکثر لوگ ایسے اسمارٹ فون کا استعمال کر رہے ہیں جس میں سبھی اقسام کی اپلیکیشن اور جدید تکنیک شامل ہے۔ عالمی سطح پر دنیا بھر کے لوگوں نے اس نئی اور دلچسپ ٹکنالوجی کو اپنی روز مرہ زندگی میں سب سے اہم ضرورت کے طور پر اپنایا ہے۔ اس کا استعمال تقریباً ہر طرح کے کاموں میں کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اس کا استعمال اب اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے طلبا تدریس واکتساب میں بھی کر رہے ہیں۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ ہر ٹکنالوجی کے اپنے فائدے اور نقصانات ہیں۔ اسی طرح اسمارٹ فون کے استعمال کے بھی اپنے فائدے اور نقصانات ہیں۔ وبائی بیماری کووڈ 19 کے دوران اور لاک ڈاؤن کے وقت میں اسمارٹ فون گھر میں بند لوگوں کے لیے تمام طرح کی سہولیات فراہم کرنے اور تفریح کے لیے بہت اہم آلے کے طور پر سامنے آیا۔ دوسری جانب

تعلیمی نظام کو آئن لائن میں تبدیل کرنے میں بھی اس نے اہم کردار ادا کیا۔ تدریسی و اکتسابی عمل مکمل طور پر اسمارٹ فون پر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے میں زیادہ تر طلبا اسمارٹ فون پر ہی اپنی پڑھائی کے کام کو انجام دے رہے ہیں۔ تصور کریں کہ اگر اسمارٹ فون نہ ہوتا تو تعلیمی نظام بالکل ٹھپ پڑ جاتا اور طلبا بھی اپنے اسکول یا اساتذہ کے ربط میں نہیں رہ پاتے۔ جن طلبا کے پاس اسمارٹ فون ہے تھوڑا بہت ہی صحیح لیکن پڑھائی سے جڑے ہوئے ہیں لیکن جن کے پاس اسمارٹ فون نہیں ہے انھیں پڑھائی میں نہایت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسمارٹ فون اور اس سے متعلق آلات نے تعلیمی نظام میں تدریس و اکتساب کے طریقوں کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کی بدولت ہی تدریس و اکتساب کا عمل گوگل میٹ، گوگل کلاس روم، زوم یا اسکائپ کے ذریعے آن لائن کلاس میں ممکن ہو سکا ہے۔ طلبا اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ کا استعمال اپنی ورچول کلاس کے لیے کر رہے ہیں۔ حالانکہ طلبا آج سے پہلے بھی اس کا استعمال کر رہے تھے لیکن وبائی بیماری کووڈ 19 نے نظام تعلیم کے منظر کو یکسر تبدیل کر دیا اور درس و تدریس کی طرز رسائی پوری طرح سے آن لائن ہو گئی ہے۔

آج بچوں کے ہاتھ میں اسمارٹ فون کی رسائی ایک عام بات ہو گئی ہے۔ ایسے والدین بھی جو بچوں کو موبائل فون سے دور رکھتے تھے تعلیم آن لائن ہونے کی وجہ سے بچوں کو اسمارٹ فون دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس سے بچوں کی جسمانی و ذہنی صحت اور شخصیت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مشاہدے میں آتا ہے کہ بچوں کو اسمارٹ فون ان کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے دیا گیا ہے لیکن وہ اس کا استعمال تعلیمی ضروریات سے کہیں زیادہ غیر تعلیمی مقاصد اور تفریح کے لیے کر رہے ہیں جس کا منفی اثر ان کی تعلیم پر ہو رہا ہے۔

اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے طلبا وہ اپنے اکتسابی و تحقیقی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے موضوع سے متعلق تمام طرح کے تعلیمی وسائل، اضافی معلومات، میگزین، اخبارات، کتابیں، لغات، سلائیڈ پیش کش و دیگر آڈیو۔ ویڈیو لیکچر وغیرہ تک رسائی کر سکتے ہیں۔ اسمارٹ فون کی مدد سے آن لائن کلاس کے بعد بھی طلبا خود مطالعے کے ذریعے اکتسابی عمل کو جاری رکھ سکتے ہیں اور کسی بھی طرح کے تعلیمی مسائل کے درپیش ہونے پر وہ معلم سے آن کال مدد لے سکتے ہیں یا رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر طلبا کسی کلاس میں غیر حاضر رہتے ہیں تو معلم اس کلاس کے لیکچر، پروجیکٹ، تفویضات اور نوٹس کو فائل، لنک، ویڈیو یا ٹیکسٹ کی صورت میں آن لائن شیئرنگ کا استعمال کر کے انھیں بھیج سکتے ہیں جسے وہ آسانی سے پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ اسمارٹ فون کے ذریعے سے اسکول کی ویب سائٹ پر امتحان، فیس، داخلہ وغیرہ سے متعلق دی گئی ضروری اطلاعات یا میسیج گھر بیٹھے مل جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے استعمال سے طلبا میں نئی مہارتوں کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ اس کا حسب ضرورت استعمال طلبا تفریح، گیمس یا تعلیمی ویڈیو دیکھنے میں کر سکتے ہیں، جس سے کہ وہ پڑھائی سے ہونے والے تناؤ کو کم کر سکتے ہیں۔

آج جب طلبا کے ہاتھوں میں اسمارٹ فون آزادانہ طور پر دے دیا گیا ہے تو بیشتر طلبا اس کا استعمال تعلیمی مقصد سے کم اور غیر تعلیمی مقصد سے زیادہ کر رہے ہیں۔ وہ اس کا استعمال، تصویر لینے، ویڈیو بنانے، تصویر و ویڈیو کی ایڈیٹنگ کرنے، ٹک ٹاک بنانے، گیمس کھیلنے، موسیقی کے لیے، کارٹون دیکھنے، یوٹیوب دیکھنے، چیٹنگ کرنے، اور سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ جیسے؛ فیس بک، ٹویٹر، انسٹاگرام کے لیے کرتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ زیادہ وقت تک جھک کر بیٹھنے یا

لیٹ کر اسمارٹ فون کا استعمال کرنے کی وجہ سے پچاس فیصد بچوں میں ریڑھ کی ہڈی کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ایک ہی جگہ پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھ کر گیمس کھیلتے رہنا یا کارٹون دیکھتے رہنا ان کی ریڑھ کی ہڈی پر منفی اثر ڈال رہا ہے۔دیر رات تک اسمارٹ فون کی اسکرین پر دیکھتے رہنا اور فون پر بات چیت کرنے کی وجہ سے نہ صرف ان کی نظریں کمزور ہو رہی ہیں بلکہ نیند مکمل طور پر نہ لینے کی وجہ سے ان میں تناؤ اور ڈپریشن جیسی بیماری بھی پیدا ہو رہی ہے۔اسمارٹ فون ایک خاص قسم کی برقی شعاؤں کا اخراج کرتے ہیں اور لمبے وقت تک اس کا استعمال کرنے سے اس کا اثر طلبا کے دماغ پر پڑتا ہے جو ان کے لیے نقصان دہ ہے۔کبھی کبھی طلبا جانے انجانے میں فحش مواد کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، جو ان کے ذہن پر منفی اثر ڈالتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات جو سامنے آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسمارٹ فون پر طلبا جن فلموں، کھیلوں اور کارٹونوں کو دیکھ رہے ہیں اس میں تشدد بہت زیادہ دکھایا جا رہا ہے۔اس سے ان کے اندر جارحانہ رویہ پیدا ہو رہا ہے جو ان کی تعلیمی کارکردگی اور شخصیت دونوں کو متاثر کر رہا ہے۔تحقیق کے مطابق تقریباً 10 فیصدی بچے ایسے ہیں جو ٹکنالوجی کا بھرپور استعمال کرتے ہیں، وہ اس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اپنا کھانا پینا بھی بھول جاتے ہیں۔اسمارٹ فون کا زیادہ استعمال کرنے سے بچے آہستہ آہستہ اس کے عادی ہو رہے ہیں اور ان کو اس کا ایڈکشن ہوتا جا رہا ہے جو ان میں ایک ایسی بیماری کی شکل اختیار کر رہا ہے جس کا ان کو شعور بھی نہیں ہے۔ اس کے اثرات ان کے برتاؤ یا رویے میں بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر ان کو اسمارٹ فون نہ دیا جائے یا ان کے ہاتھوں سے لے لیا جائے تو وہ طیش میں آجاتے ہیں اور چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی چڑچڑا پن آگے چل کر ذہنی بیماری کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔بچوں کے ہاتھوں میں اسمارٹ فون آنے سے بچے ورچول لائف کا حصہ بن رہے ہیں اور حقیقی زندگی سے دور ہو

رہے ہیں۔ ایسے حالات میں آئندہ زندگی میں انھیں مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

اب تو اسمارٹ فون کی زد میں اسکول جانے والے طلبا ہی نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے شیر خوار بچے بھی ہیں جن کے والدین نے ان کو بہلانے کے لیے اسے ان کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ والدین نے اسمارٹ فون کو بچوں کو چپ کرانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور ان کے رونے پر، کھانا نہ کھانے پر یا پریشان کرنے پر انھیں دے دیا جاتا ہے، جس سے کہ بچہ اس میں ہی الجھا رہے۔ اس کا بچوں کی فطری نشو ونما، ان کے رویے و سیکھنے کی صلاحیت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ طویل مدت تک ٹکنالوجی کا استعمال ہمارے بچوں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس کے باوجود والدین کی ایک بڑی تعداد اپنے بچوں کو اسمارٹ فون آزادانہ طور پر استعمال کرنے کی اجازت دے رہی ہے۔ جتنا چھوٹے سے چھوٹا بچہ اسمارٹ فون اچھے سے چلا لیتا ہے والدین کی جانب سے اسے مثبت پیش رفت مانتے ہوئے اس بات پر فخر کیا جاتا ہے کہ ان کا بچہ اتنا چھوٹا ہوتے ہوئے بھی نئی ٹکنالوجی سے بہت اچھی واقفیت رکھتا ہے۔ والدین یہ سوچتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ٹکنالوجی عہد حاضر کی ضرورت ہے اور ہمارے بچے اس میں اتنے ہوشیار ہیں کہ چھوٹی سی عمر میں ہی ٹکنالوجی کو سمجھ رہے ہیں۔ والدین کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ چھوٹے بچوں کو جہاں تک ممکن ہو اسمارٹ فون سے دور رکھا جائے۔ اسکول جانے والے بچوں کو ذاتی استعمال کے لیے ممکنہ حد تک اسمارٹ فون دینے سے پرہیز کیا جائے اور اگر بہت ضروری ہو اسی صورت میں محتاط ہونے کے بعد ہی اس کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ اس کے ساتھ اس بات کی نگرانی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اس کا صحیح طریقے سے استعمال کر رہے ہیں یا نہیں۔ بچوں کو صرف سخت نگرانی میں ہی اسمارٹ فون استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

چھوٹی عمر میں بچوں کی ذہنی نشو ونما کی رفتار زیادہ ہوتی ہے جو طلبا زیادہ سے زیادہ نئی چیزوں کے بارے میں سوچتے ہیں وہی آگے چل کر کچھ نیا کرتے ہیں۔ اس عمر میں ٹیکنالوجی کا ضرورت سے زیادہ استعمال ان کے ذہنوں پر بُرا اثر ڈال رہا ہے جو ان کی قوت متخیلہ کو ناقص کر رہا ہے۔ اس سے وہ کسی مجرد اشیاء کا تصور نہیں کر پاتے اور سوچنا چھوڑ دیتے ہیں، نتیجتاً ان کے دماغ کی نشو ونما متاثر ہوتی ہے۔ ایک اہم بات جو در پیش آرہی ہے وہ یہ کہ جیسے۔ جیسے طلبا اسمارٹ فون کے عادی ہو رہے ہیں ان کی دلچسپی پڑھائی میں کم ہوتی جا رہی ہے اور ان کی یادداشت بھی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

خلاصے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسمارٹ فون ایک آلہ ہے، ہر ایک آلے کی طرح اس کے بھی کچھ نقصانات اور فوائد ہیں۔ موجودہ مواصلاتی دور میں اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اس نے ہماری زندگی کے بہت سے کاموں کو آسان بنا دیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس کے غلط استعمال سے طلبا کی جسمانی اور ذہنی صحت پر نقصان دہ اثرات مرتب ہو رہے ہیں، لیکن اگر طلبا اپنے آپ پر قابو رکھیں تو وہ اس سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس سے ہونے والے نقصانات سے خود کو بچا بھی سکتے ہیں۔

■

Dr. Jaki Mumtaj
Asst Professor
Maulana Azad National Urdu University,
College of Teacher Education,
Bhopal-462001 (MP)
E-mail: jaki.mumtaj09@gmail.com

مضمون

ہماری شرارتیں اور چھدا ابا

ندیم راعی مرادآبادی

ندیم راعی مرادآبادی کا اصلی نام شفیق الرحمن ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر، افسانہ نگار اور مضمون نگار ہیں۔ اساس، ایسی بھی ایک عید، حرف حرف تیرے نام، ذہین چہرے ان کی کتابیں ہیں۔ ہندوستان کے مقتدر رسائل و جرائد میں ان کے افسانے و مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ سمیناروں کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ بچوں کے رسائل میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔

بچو! انسان کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو جائے اونچے سے اونچے منصب پر کیوں نہ فائز ہو لیکن اپنے بچپن کی کھٹی میٹھی یادیں اور شرارتیں نہیں بھولتا بچپن کے گزارے ہوئے لمحات جن میں لغزشیں، غلطیاں اور شرارتیں تو ہوتی ہیں لیکن سچائی اخلاص اور معصومیت بھی ہوتی ہے اسی طرح کی کچھ کھٹی میٹھی شرارتوں پر مبنی باتیں مجھے یاد آرہی ہیں جنھیں میں آپ سے شیئر کر رہا ہوں۔

ساٹھ کی دہائی میں اترپردیش کے معروف صنعتی شہر مرادآباد کے محلّہ گلشہید کے ساکن چھدا ابا جن کا تمباکو سپلائی کا بڑا کاروبار تھا۔ دادا میاں کے قبرستان کے سامنے، تھانہ گلشہید کے پیچھے متعدد جائیدادیں آپ کی ملکیت میں تھیں۔ آپ نہایت ہی سنجیدہ مخلص، ایثار پسند اور غریبوں کی ہمہ وقت مدد کرنے والوں میں سے تھے۔ گلشہید ہی نہیں بلکہ پورے شہر مرادآباد کی کئی غریب لڑکیوں کی شادی کرانے میں آپ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سردیوں میں غربا و مساکین کے لیے

لحاف کمبل تقسیم کرنا یہ آپ کا ہر سال کا کام تھا۔

چھدا ابا، ممبر مختار انصاری اور میرے دادا محترم چودھری علیم الرحمٰن عرف چھوٹے (جبکہ وہ چھ فٹ دراز قد تھے) جب شام کو یہ تینوں ہماری ڈیوڑھی گلشہید روڈ پر مونڈھا ڈال کر بیٹھ جاتے اور حقہ گڑگڑاتے ...... مجال ہے کوئی بھی فیشن زدہ لڑکا سر کے بڑھے ہوئے بالوں میں تیل ڈالے ان کے سامنے سے گزر جائے۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو باربر کو بلا کر اسے گنجا کرا دیتے ممکن ہی نہیں کہ وہ چوں چرا کرے، اس کے والدین کسی طرح کا اعتراض یا صدائے احتجاج بلند کریں یا پھر ان کے فیصلوں پر کوئی انگلی اٹھائے۔

گرمی کا موسم تھا اور رمضان المبارک کا مہینہ، چند لڑکے محلے میں بال بڑھائے گھوم رہے تھے۔ ایک بزرگ غلام حسین جو سڑک کے کنارے بیٹھ کر موسمی پھل بیچا کرتے تھے اور بمشکل تمام دو تین روپیہ یومیہ کما لیا کرتے تھے، نے ان نوجوانوں کو گرمی کے اس موسم میں اس طرح بال بڑھانے پر ٹوکا تو ان نوجوانوں نے چٹکی لیتے ہوئے کہا کہ ان کے پاس بال کٹوانے کے لیے پیسے نہیں ہیں اگر وہ باربر کو پیسے ادا کر دیں تو وہ اپنے اپنے سر کے بال منڈوانے کے لیے تیار ہیں۔ چونکہ وہ لڑکے جانتے تھے کہ نہ ان کے پاس اتنی رقم ہوگی کہ وہ باربر کو ادا کر سکیں نہ ان کے بال کٹیں گے لیکن غلام حسین صاحب باربر کی اجرت دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ تقریباً بیس لڑکوں نے سر منڈوائے اور چھ روپے غلام حسین صاحب کو ادا کرنے پڑے۔ ان لڑکوں کو جب ہم نے گنجا دیکھا تو ہم نے یہ سوچ کر اپنے اپنے بال منڈوانے شروع کر دیے کہ گنجا ہونے کا فیشن نکل آیا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے محلے کے تقریباً دو ڈھائی سو چھوٹے بڑے لڑکے گنجے ہو گئے۔

بچو! پولیس چوکی گلشہید اس زمانے میں شہر کی آخری فصیل تھی (اب یہاں سے تین کلو میٹر تک آبادی پھیل گئی ہے) اس سے آگے دائیں بائیں قبرستان اور امرود کے باغات تھے، کچھ دوری پر عیدگاہ .... سورج چھپنے کے بعد چوکی گلشہید سے آگے کی طرف لوگ باگ جانے سے کتراتے تھے۔ عیدگاہ سے ملتا ہوا جی ٹی روڈ نکلتا ہے اور یہاں کی رام گنگا ندی پر بنے آہنی پل سے گزرتے ہوئے نینی تال، رام نگر، بریلی، لکھنؤ کی جانب جاتا ہے۔ یہ واحد پل تھا جس پر باری باری ریل، پھر بسیں اور دیگر ٹریفک گزرتا تھا۔ ریل گاڑی کے گزرنے کے اوقات میں ٹریفک جام ہو جاتا جو عیدگاہ سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاتا جو تقریباً دو کلو میٹر فاصلہ پر مشتمل ہے۔

سحری کے بعد علی الصبح ہم سب چھوٹے بڑے شرارتی گنجے لڑکے عیدگاہ سے متصل جی ٹی روڈ کے کنارے کنارے بیٹھ جاتے بسوں اور کاروں سے گزرنے والے مسافر ایک قطار میں متعدد گنجے لڑکوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے اور انگریز مسافر تو اپنی اپنی گاڑیوں سے اتر کر ہمارے فوٹو لیتے اور حیران و ششدر رہتے کہ یہ قدیم پاٹلی پتر ہے یا جدید آزاد ہندوستان کا ایک شہر۔

کبھی کبھی ان کاروں اور بسوں کی قطاروں میں فلمی اداکار بھی ہوتے جن سے ہم لوگ ملاقاتیں کرتے، آٹوگراف لیتے، ایک بار تو ٹریجڈی کنگ دلیپ کمار بذریعہ کار نینی تال کے سفر پر تھے اور یہاں جام میں پھنس گئے اور وہ تقریباً چار گھنٹے پریشان رہے۔ ان دنوں فلم مغل اعظم ریلیز ہو چکی تھی جس نے کامیابی کے نئے ریکارڈ بنائے تھے۔ پبلک نے شہزادہ سلیم کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیے۔ حالات کو سنبھالنے کے لیے انھیں پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا اور پکے پل سے ملحق مسجد میں پناہ دی گئی جہاں انھوں نے ظہر و

عصر کی باجماعت نمازیں ادا کیں اور پھر پل کا راستہ صاف ہونے کے بعد اپنے آگے کے سفر پر گامزن ہوئے۔

شاید ہم چوتھے درجہ کے طالب علم تھے۔اتوار کے دن ہم پولیس چوکی گلشہید کے بعد سے شروع ہونے والے امرود کے باغات پہنچ جاتے جہاں پیڑ سے امرود توڑ کر اکٹھا کرنے کی اجرت میں پلو بھر امرود ملتے۔ہمارے پلو میں زیادہ سے زیادہ امرود آئیں ہم اپنے بڑے بھائی کا کرتہ یا قمیص پہن کر جاتے جس کے پلو میں اتنے امرود آجاتے کہ ان کو بمشکل تمام پولیس چوکی تک لاکر وہاں بیٹھے امرود بیچنے والوں کے حوالے کر دیتے جس سے جو رقم موصول ہوتی اس رقم سے تھیٹر جاکر ہم فلم دیکھا کرتے۔غالباً اس زمانے میں پرتھوی راج کپور، پریمناتھ وثریا کی فلم رستم سہراب، شمی کپور، کلپنا کی پروفیسر، اور اس کے علاوہ سنگم، شبنم اور میرے محبوب کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔

چھدا ابا نماز فجر ادا کرنے کے بعد اپنے گھر چلے جاتے اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد گھر سے باہر نکلتے۔سردی ہو یا گرمی وہ ہمیشہ صدری پہنے ہوتے اور اس صدری کی دونوں جیبوں میں ریزگاری بھری رہتی۔جیسے ہی وہ اپنے گھر سے نکلتے۔ہم سب بچے ان کے منتظر رہتے اور ان کے آگے پیچھے ہو لیتے۔وہ چلتے چلتے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر جو بھی سکہ ہاتھ لگتا ہمیں دے دیا کرتے۔وہ دادا میاں کے قبرستان سے ہوتے ہوئے لالہ پرہلاد کشور کی برابر والی گلی سے گزر کر گلشہید روڈ پر آتے۔بچوں کی ان کے آگے پیچھے اتنی بھیڑ ہوتی کہ ہم دوڑ کر پولیس چوکی سے ہوتے ہوئے ان کے سامنے گلی میں دوبارہ پہنچ جاتے اور ان سے پیسے وصول کرلیا کرتے۔یہ سلسلہ شام بعد نماز عصر بھی رہتا اور ہم ان سے پیسے لیتے اور خوب مزے سے کھانے پینے میں خرچ کرتے۔

ایک بار طلاق کے سلسلے میں چھدا ابا نے صرف دس منٹ لڑکی سے بات کی اور وہ لڑکی طلاق لینے سے باز آگئی۔انھوں نے اس لڑکی کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ طلاق مسئلے کا حل نہیں بلکہ ایک دوسرے پر بھروسہ اور پیار تمام مسائل کو درکنار کردیتا ہے۔طلاق کا مطلب تباہی ہے اور وہ بھی دونوں خاندانوں کی۔آپ نے اس کو مزید سمجھاتے ہوئے کہا کہ جس گھر میں طلاق رونما ہو اس گھر سے برکتیں روٹھ جاتی ہیں،طلاق کے بعد یا تو اکیلے زندگی گزارنی پڑتی ہے جو والدین پر ایک بوجھ بن جاتی ہے یا پھر نکاح ثانی کرنا ہوتا ہے جو آسان نہیں اور ذرا سی غلطی بھی ایک بڑی اور اہم غلطی شمار ہوتی ہے۔لیکن اپنے موجودہ شوہر کے ساتھ رہنے میں ہی عافیت ہے۔یہاں اگر کوئی چھوٹی بڑی غلطی ہوجائے تو دونوں نظر انداز کردیں، چھدا ابا نے اس کے شوہر کو بھی سمجھاتے ہوئے کہا کہ وہ بلاوجہ اپنی بیوی پر شک نہ کرے اور نہ ہی اس پر کسی طرح کا کوئی دباؤ بنائے، پیار، محبت سے دونوں اپنی زندگی بسر کریں۔

تو بچو! اس زمانے میں ایسے لوگ کہاں ہیں جو محلے کے بچوں کو اپنے بچے سمجھ کر ان کے نازنخرے اُٹھائیں، غربا و مساکین کی مدد کریں، لوگوں کو صحیح اور سیدھا راستہ دکھائیں اور نہ ہی آج کے زمانے میں ایسے بچے ہیں جو اپنے بزرگوں کے حکم کو بجالائیں، ان کی ہدایات کے مطابق زندگی گزاریں لیکن پھر بھی اچھے بچے وہی ہیں جو اپنے بزرگوں کا حکم مانیں اور ان کی عزت کریں۔

■

Nadeem Raee
198, Choudhry House
Gul Shaheed
Moradabad - 244001
Mob.: 8188937127

ہما محفوظ الرحمن

بین الاقوامی یوم تحمل و بردباری

مضمون

بچو! 5 ستمبر یعنی یوم اساتذہ کے بعد سے ہی ایک دن کا ہمیں شدت سے انتظار رہتا ہے اور وہ دن ہے یوم اطفال جو نومبر کی 14 تاریخ کو منایا جاتا ہے۔

لیکن آج ہم جس دن کی بات کرنے جارہے ہیں وہ بھی ہمارے لیے بہت اہم ہے اور ہمیں اس دن کے بارے میں جاننا چاہیے اور جاننے کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر جن صفات کو فروغ دینے کے مقصد سے یہ دن منایا جاتا ہے ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنا اور بڑھانا بھی چاہیے تاکہ ہم ایک اچھے شہری بن سکیں۔ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرسکیں اور پرامن اور بھائی چارہ کے ماحول میں جی سکیں۔

یوم تحمل یعنی برداشت کا دن ہر سال 16 نومبر کو یونیسکو کی جانب سے بین الاقوامی سطح پر منایا جاتا ہے۔ تحمل کو انگریزی میں Tolerance اور ہندی میں सहिष्णुता کہتے ہیں۔

تعلیمی، سائنسی و ثقافتی تنظیم برائے اقوام متحدہ، یونیسکو (The United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization) کی بنیاد 16 نومبر 1945 کو لندن میں پڑی تھی جس کا مقصد اقوام متحدہ کی ایک ایسی ایجنسی تیار کرنا تھا جو تعلیم، سائنس اور ثقافت کو بروئے کار لاتے ہوئے بین الاقوامی تعاون کے ذریعے امن عالم اور سالمیت کو فروغ دے سکے۔ یونیسکو 1995 میں اپنی بنیاد کی پچاسویں سالگرہ منا رہا تھا۔ 1995 میں ہی عدم تشدد اور اہنسا کے پجاری اور پیامبر موہن داس کرم چند گاندھی یعنی باپو کے سال پیدائش کی 125 ویں سالگرہ بھی منائی جارہی تھی۔ تحمل یعنی برداشت کی قوت اہنسا اور عدم تشدد کو اختیار کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ تحمل سے ہی انسان میں رواداری جیسی بلند صفت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو بڑا، مہذب اور وسیع القلب بناتی ہے۔ یہ صفت ہمیں مل جل کر جینا اور ایک دوسرے کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ تحمل سے انسان کے خوشگوار تعلقات میں اضافہ ہوتا ہے اور مہذب معاشرے میں اس کی جگہ بنتی ہے۔ لہٰذا یونیسکو نے اپنی تاسیس کے دن کا انتخاب کرتے ہوئے اور مہاتما گاندھی کی پیدائش کی 125 ویں

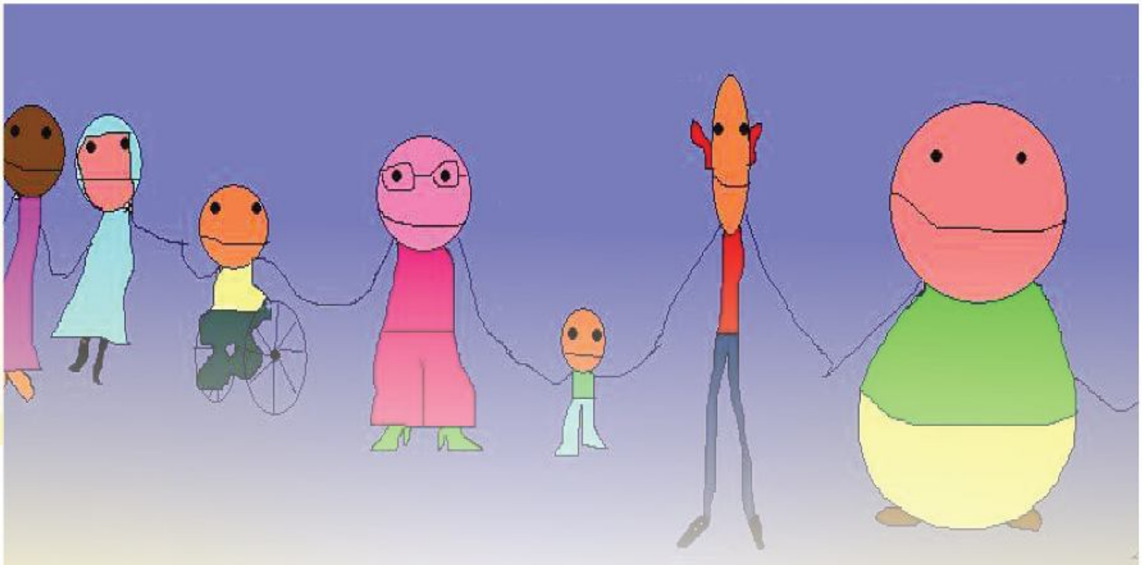

سالگرہ کو یادگار بنانے، اہنسا اور عدم تشدد کی فکر کی اہمیت سے لوگوں کو واقف کرانے اور اس کی طاقت کو سمجھنے کی غرض سے 16 نومبر کو یوم تحمل کے لیے منتخب کیا۔ اس طرح اس کے اگلے برس 16 نومبر 1996 سے اس دن کو منانے کا آغاز کیا گیا۔ 1995 میں ہی یونیسکو کے اراکین ممالک نے تحمل کے اصولوں پر مبنی ایک قرارداد بھی منظور کی۔

یہ قرارداد اس بات کی تائید کرتی ہے کہ تحمل ہماری دنیا کی رنگا رنگ اور سرمایہ دار ثقافتوں، انسانی طور طریقوں اور اظہار رائے کا احترام اور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ تحمل حقوق انسانی کے آفاقی منشور اور دوسروں کی بنیادی آزادی کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں انسان فطری طور پر مختلف افکار، خیال، مذاہب، زبان، ملک، نسل، قوم، جنس، افعال اور طور طریقوں کا حامل ہے۔ ایسے حالات میں صرف تحمل اور رواداری ہی ایسی چیز ہے جو دنیا کے الگ الگ خطوں میں بسنے والی مخلوط برادری کے درمیان تمام طرح کے اختلافات کے باوجود ہم آہنگی قائم کر سکے۔ یونیسکو کی یہ قرارداد تحمل اور رواداری کو نہ صرف اخلاقی ذمے داری بلکہ سیاسی اور قانونی تقاضوں کا بھی اہل بناتی ہے۔ یہ قرارداد اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ معاشرے میں تمام گروہوں اور افراد کے لیے علاج اور مواقع کی برابری کو یقینی بنانے کے لیے ممالک کو نئے قانون بھی بنانے چاہئیں۔

اس دن کے منانے کا سب سے اہم مقصد لوگوں کو قوت برداشت کی اہمیت سے باخبر کرنا ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ خیال ہوگا کہ قوت برداشت کیا ہے؟ والٹیئر کا خیال ہے کہ سارے انسان کمزوریوں اور خامیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ایسے میں ہم سب کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی کوتاہیوں اور بھول چوک پر ان کو معاف کر دیں اور یہی قدرت کا بھی اصول ہے۔

دنیا کے تقریباً تمام مذاہب کی تعلیمات میں بھی ایک دوسرے کو غلطیوں اور بھول چوک پر معاف کرنے کی تلقین ملتی ہے۔

آسان لفظوں میں کہیں تو قوت برداشت ایک اعلیٰ انسانی رویہ اور بلند اخلاقی اقدار میں سے ایک اہم قدر ہے جس سے انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔ اس کا

مطلب ہے کسی انسان یا گروہ کی بات یا طرز عمل پر آپ کے ردعمل میں کسی طرح کا تشدد یا زور زبردستی موجود نہ ہو۔ یعنی آپ طاقت یا تشدد کی بنیاد پر کسی فکر یا عمل کو دبانے یا مٹانے اور اپنی بات منوانے کی کوشش نہ کریں۔ جب کوئی ایسا کرتا ہے تو عدم تحمل کی صورت حال پیدا ہوتی ہے اور اس طرح تشدد کا راستہ کھل جاتا ہے۔

یوم تحمل کا مقصد اس صورت حال کا مقابلہ کرنا بھی ہے جو خوف اور دوسروں کا انکار کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ہر انسان اور بطور خاص نوجوانوں کو آزادانہ فیصلے، تنقیدی سوچ اور منطقی استدلال کی صلاحیتوں کو بڑھانے میں مدد فراہم کرنا ہے۔ ہماری دنیا میں بے شمار اور قسم قسم کے مذاہب، زبانوں، ثقافتوں، نسلوں اور جنسوں کی کثرت پائی جاتی ہے۔ یہ کثرت آپس میں تنازع یا جھگڑا کرنے کا بہانہ نہیں بلکہ وحدت کا خزانہ دیتی ہے اور ہمیں رنگارنگی کی صفت سے مالا مال کرتی ہے۔

1995 میں یونیسکو نے اس دن کے لیے ایک انعام بھی شروع کیا جس کا نام 'یونیسکو-مدنجیت سنگھ پرائز' رکھا گیا۔ مدنجیت سنگھ ایشیا، ساؤتھ امریکہ، افریقہ اور یورپ میں ہندوستان کے سفارت کار تھے۔ وہ یونیسکو کے خیر سگالی کا سفیر بھی سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے تاحیات فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن علم برداری کی۔ ان کی پہچان مصنف اور مصور کے طور پر بھی رہی ہے۔ یہ انعام یونیسکو کی جانب سے مدنجیت سنگھ کی عظیم خدمات کا اعتراف ہے۔ 'یونیسکو-مدنجیت سنگھ پرائز' انعام ہر دو سال پر دیا جاتا ہے جو ایسے اداروں، تنظیموں یا افراد کے لیے مخصوص ہے جس نے تحمل اور اہنسا کے لیے اپنی اہم اور قیمتی خدمات پیش کی ہو۔ انعام کے طور پر ایک لاکھ یو ایس ڈالر کی رقم عطا کی جاتی ہے۔

یوم تحمل عام لوگوں کو رواداری کی صفت اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کام کے لیے مختلف قسم کی تقریبات کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور تعلیم گاہوں میں بھی کئی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ مباحثہ اور ورکشاپ کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ مختلف افکار و خیالات کو نہ صرف سنیں بلکہ کسی طرح کے پر تشدد جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر ان کو برداشت کرسکیں اور پر امن ماحول میں منطقی طرز استدلال کو اختیار کرتے ہوئے ان کا جواب دیں۔ مخالف گروپ بھی اس کو بلا تشدد سنے اور برداشت کرے۔ پوسٹر کے ذریعے بھی لوگوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ مختلف افکار کے درمیان تحمل اور رواداری کی صفت کو اختیار کریں۔

پیارے بچو! ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس میں بھی کئی ریاستیں ہیں۔ پھر ان کے اندر کئی شہر، گاؤں اور محلے آباد ہیں۔ مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف نسلوں اور زبانوں کے بولنے والے لوگ موجود ہیں۔ ان کے اندر بھی مزید کئی طرح کا تنوع اور اختلاف موجود ہے۔ ہمارے کلاس روم، کھیل کے میدان، بازاروں اور کلبوں میں بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ کئی بار ہم جو کچھ سوچتے ہیں اور ہمارا جو جائز طرز عمل ہوتا ہے اس کے بالمقابل دوسری سوچ اور ہمارے سوچ کے مطابق ناجائز طرز عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں ہمارے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہم تحمل اور برد باری سے کام لیں۔ کئی مرتبہ گالی اور قابل اعتراض الفاظ کا استعمال کرکے بھی ہمیں تشدد پر ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ سب وقت ایسا ہوتا ہے کہ ہم تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کریں اور تشدد اختیار کرنے سے بچیں۔

■

Huma Mahfoozur Rahman
Deora Bandauli,
Darbhanga - 847303 (Bihar)
Mob.: 9304784544

میرا بچپن

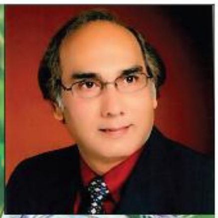

رونق جمال

بچپن کا شوق اور خوش حالی

مرغ بانی میرے بچپن کا شوق ہے۔ یہ شوق مجھے مڈل اسکول کی تعلیم کے زمانے میں ہوا تھا۔ تب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ بازار میں اچھی صحت مند وزن دار مرغی دس آنے سے لے کر بارہ آنے تک مل جاتی تھی۔ سردی کے موسم میں انڈے چار آنے کے ایک درجن مل جاتے تھے اور گرمی کے موسم میں دو آنے درجن میں مل جاتے تھے۔ بکری کا گوشت دو روپے آٹھ آنے سیر ملتا تھا۔ بیل کا گوشت ایک روپئے سیر مل جاتا تھا۔

میرا تعلق نواب خاندان سے ہے۔ اس لیے کھولا پور ضلع امراؤتی میں ہماری بہت بڑی حویلی تھی۔ تقریباً دو ایکڑ زمین کے درمیان بنی حویلی آس پاس کے ضلعوں میں بھی مشہور تھی۔ حویلی میں دادا حضرت کے چار بھائیوں کے خاندان رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ پڑھائی کے سلسلے میں سارے لوگ آکولہ، یاوت محل اور امراؤتی ہجرت کر گئے۔ میرے دادا حضرت بھی امراؤتی چلے گئے تھے لیکن میرے والد کھولا پور کی حویلی میں رکے رہے۔ اب اتنی بڑی حویلی اور ہم سات نفوس۔ ابا امی اور ہم پانچ بہن بھائی۔ والد صاحب صبح ناشتے کے بعد زمینداری کے لیے نکل پڑتے تھے اور رات آٹھ نو بجے تک لوٹ کر آتے تھے۔ مغرب ہوتے ہی ڈر لگنے لگتا تھا۔ ہم مغرب ہوتے ہی گھر کے دروازے بند کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں کھولا پور میں بجلی بھی نہیں تھی اس لیے شام ہوتے ہی اندھیرا گھرا ہو جاتا تھا۔

والد صاحب نے ہمارے خوف کے مدنظر ڈھیر ساری بھینسیں پال لی تھیں اور بھینسوں کی دیکھ بھال کے لیے بہت سے نوکروں کو حویلی میں لاکر رکھ لیا تھا۔ حویلی کے باہری حصے میں اردو مڈل اسکول کھولا پور کے بہت سارے اساتذہ کو لاکر آباد کر دیا تھا۔

میں گھر سے اسکول جانے کے لیے نکلتا تو اسکول اور گھر کے درمیان دو محلے تھے۔ میوات پورہ اور چالیس تلوار..... چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتے ہوئے دو گھروں کے درمیان سے گزرنا پڑتا تھا۔ جہاں گھروں کے سامنے مرغیوں کو دانا چگتے ہوئے دیکھ کر میرے دل میں شوق جاگا کہ میں بھی مرغیاں پالوں۔ والد صاحب سے اجازت لے کر میں نے تقریباً پچیس مرغیاں خرید لی تھیں۔ گھر میں استعمال کے بعد جتنے بھی

انڈے بچ جاتے ہیں ان پر مرغیوں کو بیٹھا کر چوزے نکال لیتا۔ پانچویں سے آٹھویں جماعت پاس کرنے تک میرے پاس تقریباً آٹھ سو مرغیاں ہوگئی تھیں۔ انڈے فروخت کر کے اچھی خاصی رقم بھی جمع ہوگئی تھی لیکن چونکہ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد مجھے ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے امراؤتی جانا تھا اس لیے سولہ مرغیاں اور چار مرغے رکھ کر باقی فروخت کرنا پڑا تھا۔ جس کا مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔

امراؤتی میں ہائی اسکول، بی اے، ایم اے کرنے کے بعد روزگار کا مسئلہ میرے سامنے آیا تو میں نے مرغ بانی کا فیصلہ کیا لیکن 1980 میں مہاراشٹر میں مرغ بانی کے لیے معقول حالات نہیں تھے اور چھتیس گڑھ میں مرغ بانی کا کاروبار عروج پر تھا۔ میں مرغ بانی کے شوق میں امراؤتی سے ہجرت کر کے درگ چلا آیا اور مرغ بانی کا سلسلہ شروع کردیا۔

ماشاء اللہ آج میرے پاس دو بڑے بڑے مرغی فارم ہیں۔ ایک فارم میں پچیس ہزار انڈے دینے والی مرغیاں ہیں۔ ان کے چھ ہزار چوزے پالنے اور چھ ہزار گرورس یعنی چوزوں اور مرغیوں کی درمیان عمر کے چوزے رکھنے کا معقول انتظام ہے۔

برائیلر فارم پر پچاس ہزار برائیلر پالتا ہوں...! میرا برائیلر فارم انٹرنیشنل لیول کا ہے۔ میرے تمام برائیلر ہاؤس ایئر کنڈیشن ہیں۔ دونوں فارم پر منیجر، سوپروائیزر، گارڈ، ڈرائیور اور لیبر ملا کر تقریباً ساٹھ لوگوں کو روزگار دیتا ہوں۔ لیبر فارم پر میرا شاندار آفس ہے جہاں چھوٹی سی لائبریری بھی ہے۔ میں لکھتا پڑھتا ہوں اور مرغ بانی کا لطف اٹھاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خوشحال زندگی گزار رہا ہوں۔ یعنی آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام بھی۔!!!!

(رونق جمال کا تعارف فروری 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے)۔

■

Ronaq Jamal
'Kainat' Street No 9,
New Adarsh Nagar
Drug - 491001 (Chattisgarh)
Mob.: 9981072672

عبدالرحیم نشتر

ممی کیوں بھیجا کھاتی ہے!

عافی عافی چلاّتی ہے
بات بات میں جھلاّتی ہے
بس پیچھے ہی پڑجاتی ہے
ممّی کیوں بھیجا کھاتی ہے

گھر سے باہر جانے نہ دے
گھر میں کسی کو آنے نہ دے
'سیکل' لے رکھی ہے لیکن
مجھ کو ہاتھ لگانے نہ دے
جانے کیوں سہمی جاتی ہے
ممی کیوں بھیجا کھاتی ہے

"لے صابن سے ہاتھ تو دھولے"
کتنی بار یہ جملہ بولے
کھڑی ہوئی ہے نل کو کھولے
عافی پورے گھر میں ڈولے
وہ خود ہی بولے جاتی ہے
ممی کیوں بھیجا کھاتی ہے

اچھلوں، کودوں، دھوم مچاؤں
ناچوں، تھرکوں، گانے گاؤں
میں بھی گھر سے باہر جاؤں
کھیلوں، کودوں، موج مناؤں
لیکن وہ گھبرا جاتی ہے
ممی کیوں بھیجا کھاتی ہے

اپنے ہاتھ میں برتن لے کے
گھوم رہی ہے آگے پیچھے
"کھالے بیٹا، کھالے بیٹا"
کیسی ممتا سے وہ بولے
پاگل جیسی ہوجاتی ہے
ممی کیوں بھیجا کھاتی ہے

■

Abdur Raheem Nashtar
103, Image Residency
Plot No: 94, Ayyappa Nagar
Nagpur - 440013 (MS)

کوثر صدیقی

ایک ہیں

ایک ہی آدم کی سب اولاد ہیں
ایک ہی دھرتی پہ سب آباد ہیں
ایک ہیں سارے جہاں کے آدمی

دھرم چاہے اپنے اپنے ہوں جدا
ایک ہے لیکن ہر انساں کا خدا
ایک ہیں سارے جہاں کے آدمی

ہند، پاکستان، امریکہ، عرب
سب کا خالق1 سب کا مالک ایک رب
ایک ہیں سارے جہاں کے آدمی

ہندو مسلم سکھ کرسچن اور یہود
ایک ہی دھرتی سے ہے سب کا وجود2
ایک ہیں سارے جہاں کے آدمی

ہر دھرم انسانیت کی جڑ ہو جب
غیریت3 کا پھر نہیں کوئی سبب
ایک ہیں سارے جہاں کے آدمی

مشکل الفاظ

1. خالق: پیدا کرنے والا
2. وجود: ہستی
3. غیریت: بے تعلقی، اجنبیت

(مارچ 2021 کے شمارے میں
ان کا تعارف شائع ہوچکا ہے)

■

Kausar Siddiqui
79, A, Ginnori Main Road
Bhopal - 462001 (MP)
Mob.: 9926404171

اچھی بچی

عطیہ پروین

عطیہ پروین کا اصل نام سیدہ امت الزہرا ہے۔ ان کا تعلق ادبی اور تاریخی قصبہ بلگرام، اتر پردیش سے ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ ہیں جس میں بہت سے ادیب، شاعر اور خطیب پیدا ہوئے۔ انھوں نے 13 سال کی عمر میں پہلا افسانہ لکھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ عطیہ پروین نے تقریباً 35 کتابیں لکھی ہیں جو علمی اور ادبی حلقے میں بہت مقبول ہوئیں۔ ڈھائی تین سو کے قریب افسانے بھی تحریر کیے۔ انھیں مختلف اداروں نے ایوارڈ سے بھی نوازا۔ بچوں کے رسائل امنگ، گل بوٹے، نیا کھلونا، نرالی دنیا اور بچوں کی دنیا میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔

میں اک چھوٹی بچی ہوں
امی کہتیں اچھی ہوں...
دادی سے میں کرتی پیار
سچ جانیں میں سچی ہوں
پانی لاکر لوٹے میں
ان کو وضو کراتی ہوں
جب وہ اٹھتیں بستر سے
چپل انھیں پہناتی ہوں
اپنے دادا جانی کو...
انگلی پکڑ چلاتی ہوں
اور ابو کی بات ہی کیا
نخرے انھیں دکھاتی ہوں
وہ کہتے منی بی بی
میں کہتی جی آتی ہوں
چٹ سے پیار وہ کرتے ہیں پھول سی میں کھل جاتی ہوں
منے بھیا اور آپا.....
سب ہی کو میں بھاتی ہوں

کھانا ساتھ میں امی کے
مل کر میں پکواتی ہوں
چمچہ لاکر دیتی ہوں
برتن بھی دھلواتی ہوں
اور جناب ذرا سن لیں
روز اسکول بھی جاتی ہوں
ٹیچر سب خوش مجھ سے ہیں
فرفر سبق سناتی ہوں...
آپا نے جو سکھلایا
ان کو دعا سناتی ہوں
آپ اگر اچھی کہہ دیں
تو آداب بجاتی ہوں.....
پیار سے اپنی مینا کو
دانہ روز کھلاتی ہوں

■

Atia Parween
Village & Post: Saidpur Rudauli
District: Faizabad - 225407 (UP)

نظم

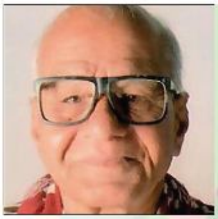

فیض رتلامی

بچوں کی دنیا

سب بوڑھے جواں اور چھوٹوں کا ارمان ہے بچوں کی دنیا
پڑھتے ہیں محبت سے اس کو ریحان ہے بچوں کی دنیا
بھارت سے عقیدت رکھتا ہے بھارت سے محبت کرتا ہے
بھارت کا رسالہ بھارت میں ایک شان ہے بچوں کی دنیا
ہو ہندو، مسلم سکھ کوئی یا پارسی ہو یا عیسائی
مالا کی طرح رہتا ہے ہمیں اعلان ہے بچوں کی دنیا
دیتا ہے زمانہ اس کو دعا چاہا ہے سبھی نے اس کو سدا
بوڑھے بھی جواں بھی پڑھتے ہیں احسان ہے بچوں کی دنیا
یہ ایک بنا کے رکھتا ہے یہ نیک بنا کے رکھتا ہے
'اللہ' کا اس میں نور دکھا بھگوان ہے بچوں کی دنیا
گھر گھر میں سبھی پڑھتے ہیں اسے سب لوگ منگاتے بھی ہیں جسے
ہے فخر ہمیں اس بھارت میں ذی شان ہے بچوں کی دنیا
کیا اس کا تعارف دینا ہے کچھ بھی تو نہ دینا لینا ہے
بوڑھا بھی جواں بھی بچہ بھی انسان ہے بچوں کی دنیا
دیتے ہیں، معافی سب ان کو اور پیار بھی دیتے ہیں جن کو
غلطی بھی کبھی ہوجاتی ہے انجان ہے بچوں کی دنیا
کچھ باتیں پرانی آتی ہیں کچھ ساتھ میں یادیں لاتی ہیں
اے فیض کریں کیا تم اور ہم نادان ہے بچوں کی دنیا

(فیض رتلامی کا تعارف دسمبر 2020 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)۔

■

Faiz Ratlami
48, Samta Nagar
Ratlam- 457001 (MP)
Mob.: 7879690200

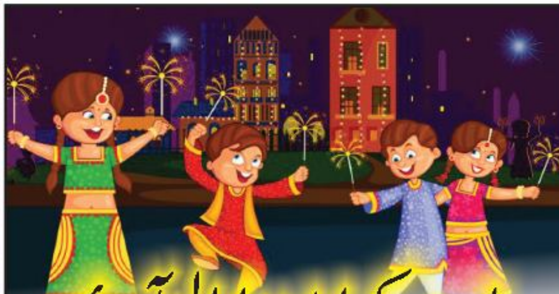

اب کے یوں دیوالی آئے

خدایا! اب کے یوں دیوالی آئے
وطن میں ہر جگہ خوش حالی آئے

محبت کے دیے ہوں دل میں روشن
وفا کے زرد رخ پہ لالی آئے

دے اجلی صبح دروازے پہ دستک
نہ گھر میں رات کوئی کالی آئے

ہو شکتی مان کا دل موم جیسا
ہر ایک چٹان پر ہریالی آئے

بدل ڈالیں گی رخ اپنا بہاریں
خبر گلشن کی لینے مالی آئے

خدایا! اب کے یوں دیوالی آئے
وطن میں ہر جگہ خوش حالی آئے

(فروری 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف شائع ہوچکا ہے)۔

■

Mateen Achalpuri
Opp. Masjid, Akbari Chowk
Biyabani Achalpur-444806
Dist Amravati (Maharashtra)
Cell: 09503199586

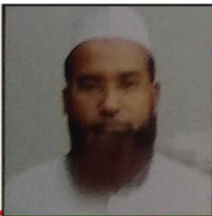

خورشید جمال قاسم

فصلِ بہاراں

فصلِ بہاراں اب ہے آئی
ہر سو ہے ہریالی چھائی
پیلے لال گلابی پھول
کہیں نہ گرمی کہیں نہ دھول
باغ میں چڑیوں کا وہ گانا
پھول پہ بھنوروں کا منڈرانا
موسم کا یہ جادو ہے
رعنائی ہے، خوشبو ہے
ہر سو کلیاں کھلتی ہیں
دل کو خوشیاں ملتی ہیں
بچے بورھے سبھی یہ گائیں
ایسے لمحے کبھی نہ جائیں

■

Dr. K. J. Qasim
Israil Katra, Bagicha, Johanaganj
Azamgarh - 276131
Mob.: 9628622895

اردو سے تم خوب محبت پیار کرو

شکیل سہسرامی

شکیل سہسرامی کا تعلق شیر شاہ سوری کے شہر سہسرام سے ہے۔ انھوں نے مگدھ اردو یونیورسٹی گیا سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ اس وقت بہار قانون ساز کونسل کے اردو سیکشن سے وابستہ ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے آوارجہ، نظافتِ سخن اور تبصروں کا مجموعہ 'گل بانگ' چشم و قلم' شائع ہوچکے ہیں۔ ہندوستان کے مقتدر اخبارات و مجلّات میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ بچوں کے رسائل 'کھلونا' 'بچوں کی دنیا'، 'امنگ' (نئی دہلی) میں ان کی تحریریں چھپتی رہی ہیں۔

سمجھو قیمت وقت کی اس سے پیار کرو
ناکامی سے خود کو مت دوچار کرو
شخصیت کا یوں اعلیٰ معیار کرو
تم اپنے کو آئینہ کردار کرو
خود کو رکھو روز و شب مصروفِ عمل
کام نہ ہرگز کوئی بھی بے کار کرو
دینے والا ساتھ خدائے واحد ہے
بے باکی سے سچ کا تم اظہار کرو
کورونا کا قہر ابھی بھی جاری ہے
پیارے بچو مت سیر بازار کرو
کھڑکی کھولو فین چلاؤ کمرے کا
مت اے سی میں اپنے کو بیمار کرو
اردو ہے تہذیب ہماری صدیوں سے
اردو سے تم خوب محبت پیار کرو
رکھنا ہے سرسبز اگرچہ دنیا کو
ہریالی کا ہر جانب پرچار کرو
گمنامی میں لطف بہت ہے جینے کا
مت اپنے کو تصویرِ اخبار کرو
سمجھو قیمت وقت کی اس سے پیار کرو
ناکامی سے خود کو مت دوچار کرو
اردو سے تم خوب محبت پیار کرو

■

Shakeel Sahsarami
Near Rahman Masjid
Mohalla: Suman Pura, Raja Bazar
Patna - 800014 (Bihar)
Mob.: 9835642267

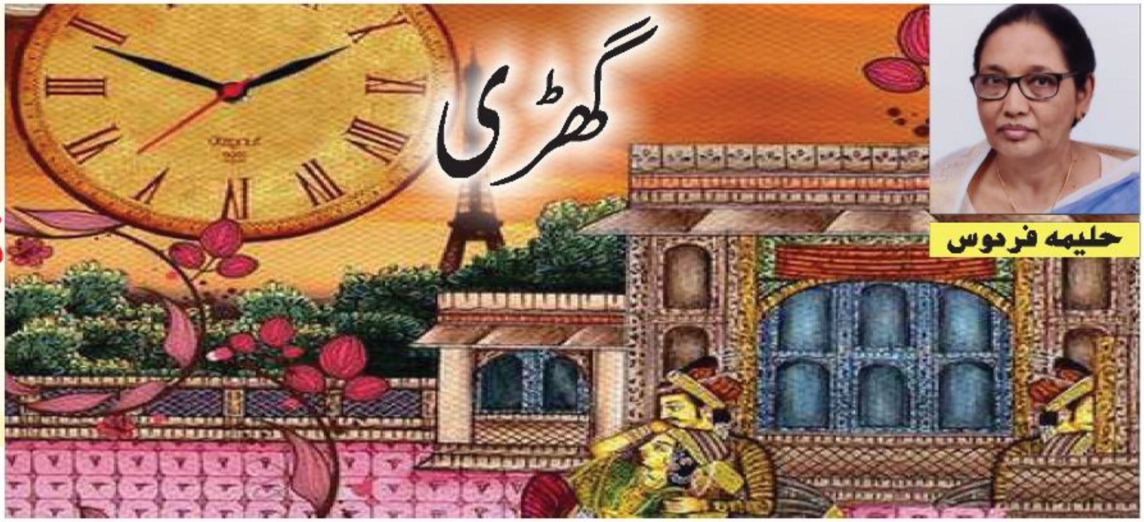

پیارے بچو! آج میں آپ سے اعداد (گنتی) کی زبان میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ گھبرائیے نہیں یہ کوئی اجنبی زبان نہیں ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں اعداد یعنی نمبرات سے میرا گہرا رشتہ ہے۔ آپ میری اعداد کی زبان سمجھتے ہیں نا؟ میری باتیں غور سے سنیے۔ ذرا دماغ پر زور ڈالیے۔ آپ نمبروں میں چھپے الفاظ کے سہارے میری کہانی دُہراتے جائیے مگر زبان سنبھال کے۔

آئیے میں آپ کو نواب نوازالدین کے گھر کا حال بتاتی ہوں۔ نواب صاحب کا شمار شہر کے عزت دار لوگوں میں ہوتا تھا۔ جناب جیبی گھڑی اور ہاتھ کی چمچماتی شیشم کی چھڑی کے بغیر ادھورے سے لگتے تھے۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ تقریباً 40 سال پہلے بھاری قیمت ادا کر کے مجھے گھر لے آئے تھے اور بڑے پیار سے دیوان خانے کی دیوار پر لگایا تھا۔ میری وجہ سے گھر میں چار چاند لگ گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کا سینہ فخر سے پھول جاتا تھا۔ نواب صاحب کے لیے میں وقت بتانے والا آلہ نہیں تھی بلکہ ان کی جان تھی۔ میری ٹِک ٹِک ٹِک کی آواز انھیں بڑی بھلی لگتی تھی۔ ہاں جھولتے پنڈولم اور ہر گھنٹے پر نکلتی زور کی آواز پر ان کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہائے افسوس ایک دن ان کی زندگی کا سفر ختم ہو گیا۔ مجھے ان کے جانے کا دُکھ ہوا پر میں کیا کرتی؟ میرا سفر تو آج بھی جاری ہے۔ میری زندگی کا مقصد ہی چلتے رہنا ہے۔ ٹِک ٹِک ٹِک...

اب ذرا نواب صاحب کے پوتے اور پوتی کا حال بھی سن لیجیے۔ نوید اور نوشابہ بھائی بہن تو ہیں پر دونوں میں نہیں بنتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بات پر محترمہ نوشابہ کا موڈ آف ہو جاتا۔ نک چڑھی کہیں کی۔۔۔ اُس کے ممی پپّا نے اُسے سر پر بٹھا رکھا ہے۔ اِدھر فرمائش کی اور اُدھر پوری۔ اس کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں اور اس کا دماغ ہمیشہ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ کبھی اپنا دُپٹہ نہ ملنے پر امّی کو آواز دے رہی ہے تو کبھی اپنے دستانے ڈھونڈنے کے بہانے گھر کو کباڑ خانہ بنا دیتی ہے۔ بچارا نوید خاموش اپنی پڑھائی میں مگن رہتا ہے۔ اس نے کسی کو دوٹوک جواب دینا سیکھا ہی نہیں تھا۔ گھڑی دو گھڑی چین سے بیٹھنے نہیں پاتا کہ وہ آفت کی پُڑیا سر پر سوار ہو جاتی بے جا سوالات سے بھائی کا سر کھاتی رہتی۔ ایک بار پوچھنے لگی بھیا! گھڑیاں گننے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ہمارے گھر میں ایک ہی گھڑی ہے نا؟ نوید نے

کہا ''گھڑی کا مطلب تم جو اپنی کلائی پر باندھتی ہو یا جو دیوار پر لگی گھڑی نہیں۔ وقت کو بھی گھڑی کہتے ہیں۔'' ہاں۔ یاد آیا۔ میری ٹیچر بتا رہی تھیں ''وقت جا کر نہیں آتا۔'' کیا وقت کے پاؤں ہوتے ہیں؟ نوشابہ نے دوسرا سوال پوچھا ''افوہ تمہاری جہالت کی حد ہے۔ وقت کے پاؤں نہیں ہوتے۔'' تمھارے تو پاؤں ہیں نا۔ بہن کے سر پر چپت لگاتے ہوئے نوید نے سوال کیا ''تم اپنی سالگرہ ایک سال میں کتنی بار مناتی ہو؟'' نومبر گزرنے کے بعد تمھیں اگلے سال کا انتظار ہوتا ہے کہ نہیں۔ اُس چلبلی نے بھائی کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ''بالکل صحیح جواب'' بہن کی بات پر دھیان دیے بغیر وہ پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ نوشابہ کہاں خاموش رہنے والی تھی بڑے فخر سے کہنے لگی ''او، کتابی کیڑے مجھے بیوقوف نہ سمجھنا میں تو تمھیں چھیڑنے کے لیے اس قسم کے سوالات کر رہی تھی۔''

میں چُپ چاپ دونوں کی باتیں سنتی رہی۔ مجھے اُس لڑکی کی حماقت پر غصہ آیا۔ مجھ سے اس کی یہ حرکتیں دیکھی نہیں جاتیں۔ ایک دن وہ امتحان کے لیے اسکول جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ گھڑی گھڑی اس کی نظریں میری جانب اُٹھ رہی تھیں۔ ناشتہ کرتے کرتے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ممّی اس گھڑی کو نکال پھینکو یہ ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ اس پُرانی گھڑی کی ضرورت نہیں ہے اب۔ اس کی وجہ سے میں اسکول کے لیے لیٹ ہوگئی۔ اگر میرا پرچہ چھوٹ گیا تو اس گھڑی کی خیر نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ غصہ سے گھر سے نکل گئی۔

نوشابہ کی باتوں سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہوا کے زور کے جھونکے سے میں فرش پر آ گری۔ آواز سن کر نوید دوڑا دوڑا آیا۔ مجھے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا۔ گھڑی ساز کے پاس لے جا کر مجھے ٹھیک کروایا اور دادا جی کی نشانی کو اپنے کمرے کی دیوار پر لگا دیا۔ آج کل نوید مجھے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور میں اُسے دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ وہ ناقدری لڑکی، اپنی پلاسٹک کی ڈیجیٹل گھڑی پہن کر اِتراتی پھرتی ہے۔ اُسے کیا پتہ پہلے زمانے کی سنہری اور چاندی سی چمکتی گھڑیاں کس قدر مضبوط ہوا کرتی تھیں۔ جسے صرف بڑے لوگ ہی پہنا کرتے تھے۔ بچوں کے لیے یہ کوئی کھلونا نہیں تھی۔ آج کل مختلف بناوٹ اور مختلف رنگ کی پلاسٹک کی گھڑیاں بنائی جا رہی ہیں انھیں استعمال کرو اور پھینکو والا معاملہ ہوتا ہے۔

فیشن کے دیوانوں نے ڈیجیٹل گھڑیوں سے سوئیاں ہی غائب کر دی ہیں۔ وہ کیا جانیں اِن سُوئیوں کی اہمیت۔ ان کی حقیقت میں بتاتی ہوں۔ یہ سیکنڈ، منٹ اور گھنٹے بتانے والی سُوئیاں تین بہنیں ہیں۔ کوئی ان سے محبت کا سبق سیکھے۔ وہ اپنا اپنا چکر مکمل کرتے وقت پیار سے گلے ملتیں اور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ان دیوانوں نے پہلے دُبلی پتلی نازک سی سیکنڈ بی بی کو نکال باہر کیا۔ اس پر ان کا دل ٹوٹ گیا۔ کیا بتائیں؟ اِن ظالموں نے سب کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے، اب گھڑیوں میں صرف نمبر اور لکیروں کے نشان رہ گئے ہیں۔ افسوس ہمارا وجود بھی مٹنے لگا ہے۔ ہمیں سیل فون میں قید کیا گیا ہے۔ خیر یہ وقت وقت کی بات جہاں بھی جگہ ملے ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔

بچو! گھڑی کوئی کھلونا نہیں ہے۔ یہ وقت کی قدر کرنا سکھاتی ہے۔ جو گھڑی باندھ کر بھی وقت کی قدر نہ کرے وہ جاہل ہے۔ اُس کی مثال ایسے گدھے کی سی ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لاد دی گئی ہیں اور وہ علم کی اہمیت سے ناواقف ہے۔ اچھا اب اجازت دو۔ رُکنا میری فطرت نہیں۔ ٹِک ٹِک ٹِک...

(ان کا تعارف دسمبر 2020 کے شمارے میں شائع ہوچکا ھے)۔

■

Dr. Haleema Firdaus
414-A1, Ganga Block National Games
Village Koramangala
Bangalore - 560047 (Karnataka)

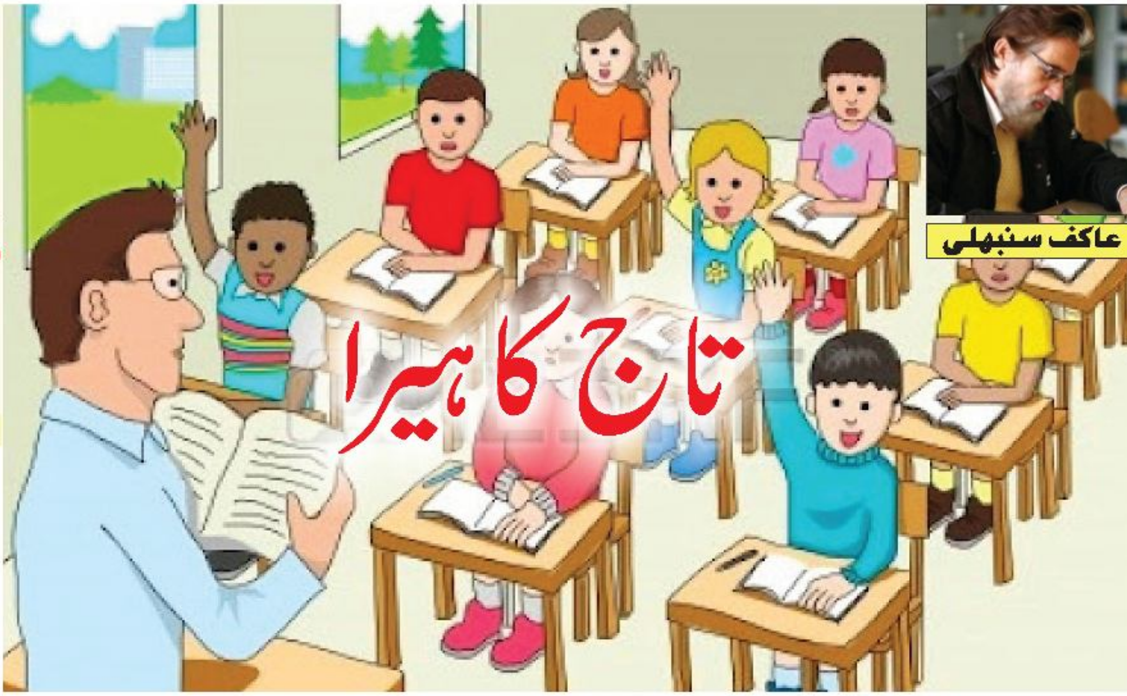

عاکف سنبھلی

تاج کا ہیرا

چھٹی کی گھنٹی بجی۔ سبھی بچے اسکول سے باہر نکل پڑے۔ تیز تیز قدموں کے ساتھ شیراز بھی اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ آج ماسٹر صاحب نے پھر اسے بہت سخت وسست کہا تھا۔ کلاس کے دوسرے بچوں کے سامنے اس کو ڈانٹا، پھٹکارا تھا۔ یوں تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ ہر روز کا معمول یہی تھا۔ تقریباً اسکول کا ہر ایک ٹیچر ہی اس کو بری نظر سے دیکھتا، اس کی سرزنش کرتا۔ بالخصوص میتھ کے ٹیچر جو اسکول کے پرنسپل بھی تھے۔ اس کو تو وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ دراصل یہ کوئی اس سے دشمنی کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ اس کا پڑھائی میں دلچسپی نہ لینا، وقت پر اپنا کام نہ کرنا، اساتذہ کا کہنا نہ ماننا اور اپنے وقت کو غیر ضروری کاموں میں برباد کرنا تھا۔ اس کے اس رویے سے اس کے والدین بھی بہت ناراض تھے۔ وہ بھی اسکول آکر عموماً ٹیچر سے اس کی شکایت کیا کرتے اور ٹیچرس کی ہدایات کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا اور وہ اپنی دنیا میں مگن زندگی کے ایام گزار رہا تھا۔

آج کلاس میں پرنسپل صاحب نے اس سے جو بات کی تھی۔ اس نے شیراز کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا۔ بیٹا شیراز! یوں تو تم روز ہی اسکول آتے ہو۔ مگر سوچو تو سہی اس طرح اسکول آنے سے تمھیں کیا فائدہ؟ جب تم کچھ لکھتے پڑھتے ہی نہیں۔ اسکول آنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم گھر سے اسکول آؤ۔ اور خالی وقت ضائع کر کے یا غیر ضروری کاموں میں وقت برباد کر کے گھر واپس چلے جاؤ۔ اس طرح تمہارا وقت برباد تو ضرور ہو رہا ہے۔ اس سے تمھیں کسی طرح کا کوئی فیض حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ تمہارے اس عمل کو دیکھتے ہوئے ہم یہی سوچنے پر مجبور ہیں کہ تم راستے میں پڑے ہوئے اس پتھر کی طرح ہو جس پر چلنے والے ٹھوکریں تو ضرور مارتے ہیں مگر اس کو عزت وقدر کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ انھوں نے شیراز سے اسی طرح کی کچھ اور باتیں بھی کہیں اور اس کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ آج اس پر پرنسپل صاحب کی ان ہدایات کا اثر بھی ہوا تھا۔ اور وہ اس سلسلے

میں کچھ سوچنے پر بھی مجبور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جس راستے سے وہ گزرتا تھا۔ وہاں واقعی ایک بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا۔ جس کو آنے جانے والوں کی حقارت بھری نظروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اکثر لوگ اس کو ٹھوکریں بھی مارا کرتے تھے۔ اس طرح ان کا مقصد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ ہر وہ چیز جو کسی کے کام کی نہیں آیا کرتی۔ لوگ اس کی وقعت نہیں بلکہ تذلیل کیا کرتے ہیں۔ شیراز سوچ رہا تھا۔ آج اس کی حیثیت بھی اسی پتھر کی طرح ہے کہ اپنے کردار و عمل کی بنیاد پر وہ دوسروں کے تو کیا کام آسکتا ہے۔ خود اپنی ذات کو بھی کسی طرح کا کوئی فیض پہنچانے کی صلاحیت اس میں نہیں ہے۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے والدین اور اساتذہ کسی ذاتی وجہ سے اس سے ناراض نہیں رہا کرتے ہیں۔ بلکہ اس میں تو اس کے لیے ایک پیغام چھپا ہوا ہے جسے وہ آج تک سمجھ ہی نہ سکا تھا۔

آج پرنسپل صاحب کی ہدایت سے اس کا ضمیر جاگا تھا۔ اور اس نے اپنے کردار و عمل پر نظر ڈالنی شروع کی تھی۔ اس کے اندر اچھے، برے میں تمیز کرنے کی صلاحیت بیدار ہو رہی تھی۔ اس کے اندر ہونے والی اس تبدیلی کا خود اس کو بھی احساس ہو رہا تھا۔ اسی شعور کے تحت اب وہ اپنے سابقہ کردار کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنے والدین کی فکر اور اساتذہ کی ہدایات کی اہمیت کو جان چکا تھا۔ اسی تبدیلی کے مطابق اس کا ذہن یہ طے کر رہا تھا کہ اب وہ اپنے اساتذہ کی ہدایتوں کی روشنی میں اپنی زندگی گزارے گا۔ انہی کے مطابق کام کرے گا اور اپنی زندگی کو بدل کر رکھ دے گا۔ اس وقت اس کا ضمیر پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ شعور جاگ چکا تھا۔ اب اس کو اپنے برباد کیے ہوئے وقت پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اسے شدت سے اس نقصان پر افسوس ہو رہا تھا۔ جو وہ اپنی نادانیوں سے کر چکا تھا۔

اس لیے اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کو اب بہت زیادہ محنت کرنی ہوگی۔ کہ اپنا پہلا نقصان بھی پورا کرنا ہے اور آگے کا کام بھی مکمل کرنا ہے۔ اس طرح اس نے سخت محنت اور سچی لگن کے ساتھ اپنے کام میں لگ جانے کی ٹھان لی اور تن، من، دھن سے اپنے کام میں جٹ جانے کا پختہ عہد کر لیا۔ ایک مضبوط اور پختہ عہد۔ اسی سوچ و فکر میں ڈوبا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا اور اپنے گھر پہنچ گیا۔

اسکول تو وہ روز ہی جاتا۔ مگر آج اس کے رویے میں بہت فرق تھا۔ اب وہ پہلے والا شیراز نہیں۔ بلکہ ایک نئے اور مضبوط قوت ارادی والا شیراز تھا۔ سنجیدہ اور سیریس، پڑھنے لکھنے کا عزم رکھنے والا، اپنے وقت کو صحیح استعمال کرنے والا اور اپنے کردار و عمل کو مضبوط و مستحکم بنانے والا۔ اب اسے راستے کا پتھر نہیں بلکہ میل کا پتھر بن جانا تھا۔ وہ پتھر جسے دیکھنے والے 'سنگ میل' کہا کرتے ہیں جسے دیکھ کر مسافت کا اندازہ لگاتے ہیں اور منزلوں کے نشاں حاصل کرتے ہیں۔ آج وہ اسکول جا رہا تھا۔ ایک انوکھی شان اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ۔ اس طرح وہ اسکول میں داخل ہوا۔ اور اپنے تعلیمی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ آج اس کے ساتھی اور استاد سب ہی اس کے اندر بڑا فرق محسوس کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شیراز سابقہ معمول کے مطابق نہ تو کسی سے زیادہ ہنسی مذاق ہی کر رہا ہے، نہ کھیل کود میں مصروف ہے اور نہ ہی بیہودہ کاموں میں مشغول ہو کر اپنے وقت کو ہی برباد کر رہا ہے۔ اس طرح وہ شیراز کے اندر تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ ایک بڑی تبدیلی۔

آج کا پورا دن شیراز نے پڑھائی، لکھائی اور اچھے کاموں میں گزارا تھا۔ وہ تقریباً پورے ہی دن تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہا تھا اور پوری لگن و دلچسپی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا تھا۔ اس طرح سب نے ہی اس کے اندر ایک بڑا

بدلاؤ محسوس کیا تھا۔ جس کی بدولت اب شیراز پہلے والا شیراز نہیں بلکہ ایک نیا شیراز لگ رہا تھا۔ ایک ایسا بچہ جو شریف و سنجیدہ ہونے کے ساتھ ہی پڑھنے، لکھنے والا بچہ ہو۔ جو شرارت و کاہلی کو جانتا بھی نہ ہو اور نہ بیہودگی ہی اس کا شیوہ ہو۔ آج اسکول میں جس طرح اس کا دن گزرتا تھا اور شیراز نے جو اچھی باتیں اور تعلیمی چیزیں سیکھی تھیں۔ ان سے اب اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ پہلے اس کی طرف سے کی گئی غفلت اور غیر ذمے داری کی بدولت اس نے اپنا زبردست نقصان کر لیا تھا۔ جس کی اب اس کو بھرپائی کرنی تھی۔ اس کے لیے اب وہ پورے عقل و شعور اور عزم و ہمت کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔

اسکول میں یوں تو پہلے بھی اچھا اور پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ مگر اب شیراز کی تبدیلی کے ساتھ پورا ہی اسکول تعلیم کا گہوارہ بن گیا تھا۔ وہ ذہین تو تھا ہی۔ ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہی وہ کامیابی کی منزلوں پر چل نکلا اور چند ماہ میں ہی اپنے اکثر ساتھیوں سے آگے نکل گیا۔ جس کے نتیجے میں سب ہی اس سے محبت کرنے لگے۔ خاص طور پر پرنسپل صاحب تو بہت ہی خوش تھے۔ اب وہ بھی اس سے محبت کرنے لگے تھے۔ اس کے اچھے کاموں کی وجہ سے۔

تعلیمی سال مکمل ہوا۔ امتحان کا وقت آ گیا۔ سبھی بچے اس کی تیاری میں لگے تھے۔ شیراز تو تن، من، دھن سے اس کی تیاری میں جٹا ہوا تھا کہ اس کو امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے اوپر لگے ہوئے بدنامی کے داغوں کو مٹانا تھا۔ اساتذہ کی ہدایت و رہنمائی کی روشنی میں اس نے شدید محنت و جدوجہد کی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کے سبھی پیپر اچھے ہوئے تھے۔ جس کی بنیاد پر اس کو اچھی پوزیشن کے ساتھ کامیابی کا پختہ یقین تھا۔ امتحان ہوئے۔ رزلٹ آیا۔ امید کے مطابق شیراز امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ صرف اپنے درجے میں ہی نہیں بلکہ پورے اسکول میں اوّل نمبر پر آیا تھا۔ جس کی خوشی خود شیراز اور اس کے دوستوں کے ساتھ ہی تمام اساتذہ کو بھی تھی۔ پرنسپل صاحب تو اس کی کامیابی پر جھوم اٹھے تھے۔

شیراز کی کامیابی کی اطلاع اس کے گھر پہنچ چکی تھی۔ اس کے امی، ابو خوشی خوشی اسکول دوڑے چلے آئے۔ پرنسپل صاحب نے شیراز کو اپنے آفس میں بلایا۔ وہاں جا کر دیکھا اس کے اساتذہ کے ساتھ ہی والدین بھی وہاں موجود تھے۔ پرنسپل صاحب نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''پیارے شیراز! تعلیم کے سلسلے میں تمہارا پہلے جس طرح کا رویہ تھا۔ اس کی وجہ سے ہمارا تم سے ناراض ہونا تمھاری محبت کی وجہ سے تھا۔ اب تم خود ہی سوچو جب سے تم نے اپنا رویہ بدلا اور تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کی۔ تمھارے استاد تم سے کس قدر خوش ہوئے۔ خدا کا شکر کہ جلد ہی تم نے کامیابی حاصل کر لی اور خود کو بڑے نقصان سے بچا لیا۔ تمھارے اسی بدلاؤ کا نتیجہ ہے کہ آج تم اچھے نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوئے ہو اور ہم سب تم کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ شیراز! اب تم راستے کا پتھر نہیں۔ میل کا پتھر بھی نہیں بلکہ 'تاج کا ہیرا' یعنی ایسا ہیرا بن چکے ہو جو بادشاہوں کے تاج میں لگایا جاتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے پرنسپل صاحب جذباتی ہو گئے۔ انھوں نے اٹھ کر شیراز کو گلے لگا لیا اور دعاؤں سے نوازا۔ خوشی کے پھول اس کے اساتذہ کے ساتھ ہی ابو، امی کے چہروں پر بھی کھلے ہوئے تھے۔

■

Dr. Razaur Rahman Akif Sambhali
Miyan Sarai, Katra Bazar
Sambhal - (UP)
Mob.: 9837826809

جہانگیر انس

عقلمند اندھا

ایک شخص جو آنکھوں سے اندھا تھا، عقل سے نہیں۔ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ بیوی نہ بچہ۔ پیٹ بھرنے کے لیے ہر جاندار کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اندھا پڑھا لکھا تھا نہیں کہ کوئی ڈھنگ کا کام کرتا اور نہ جوان اور صحت مند تھا کہ محنت مزدوری کرتا۔ اس لیے بھیک مانگ کر پیٹ بھرتا تھا۔ جنگل میں اس نے پھوس کی ایک جھونپڑی ڈال لی تھی۔ کسی کسی دن وہ جنگل کے کنارے بنی سڑک پر آ کر ایک طرف بیٹھ جاتا، جو کچھ مل جاتا اسے صبر وشکر کے ساتھ استعمال کرتا۔ اسے زیادہ کی خواہش نہیں تھی۔ روایتی فقیروں کی طرح وہ دن رات بھیک کا کشکول لیے مارا مارا نہیں پھرتا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھا چڑیوں کی چہچہاہٹ اور جانوروں کی اچھل کود سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔

ایک دن وہ اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھا تھا کہ اسے آگے پیچھے دو جانوروں کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے کچھ دیر بعد گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ شکار کا موسم تھا، جانوروں کے بھاگنے کی آوازیں اور گھوڑوں کی ٹاپ اکثر سنائی دیتی۔ اس لیے اس نے اس پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا لیکن جب گھوڑے کی ٹاپ اس کے قریب آ کر خاموش ہوگئی تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔

گھوڑے پر سوار شخص نے ڈپٹ کر پوچھا ”اے اندھے ابھی کچھ دیر پہلے ادھر سے کوئی گزرا؟“

اندھے نے جواب دیا ”نہیں، مائی باپ میں نے کسی کے گزرنے کی آواز نہیں سنی ہے۔“

گھڑسوار نے خواہ مخواہ اندھے کو کچھ الٹا سیدھا کہا دو چار گالیاں رسید کیں اور آگے بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد پھر گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی جو پہلے ہی کی طرح اس کی جھونپڑی کے پاس آ کر رک گئی اور کسی نے رعب دار آواز، لیکن شریفانہ انداز میں پوچھا ”بڑے میاں! ادھر سے کچھ دیر پہلے کوئی گزرا ہے۔“

اندھے نے جواب دیا ”ابھی کچھ دیر پہلے ایک شخص گھوڑے پر گزرا ہے۔“

سوال کرنے والے نے اندھے کا جواب سن کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا گھوڑا آگے بڑھا لے گیا۔

دوسرے گھڑسوار کے جانے کے کچھ دیر بعد پھر کئی

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ایک ساتھ سنائی دینے لگی جو اس کی جھونپڑی کے نزدیک آکر ختم ہوگئی اور ایک شخص کی آواز سنائی دی ''بابا! آپ یہاں کب سے بیٹھے ہیں؟''

اندھے نے جواب دیا ''صبح سے، اب دوپہر ہونے کو آئی۔''

اس شخص نے پھر پوچھا ''ادھر سے کوئی گزرا ہے؟''

اندھے نے جواب دیا ''جی ہاں بادشاہ سلامت!! پہلے ہرنی گئی اس کے پیچھے ہرن اچھلتا کودتا گیا۔ پھر کوتوال گزرا۔ کوتوال کے بعد وزیر اور اب آپ بادشاہ سلامت تشریف لے جارہے ہیں۔''

تیسرا سوار واقعی بادشاہ تھا جس کے ساتھ چند سپاہی بھی تھے۔

اندھے کی بات سن کر بادشاہ کو تعجب ہوا کہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ پہلے کون کون گزرا ہے اور اب اس سے کون مخاطب ہے اس نے اندھے سے پوچھا ''بابا! آپ تو اندھے ہیں پھر آپ نے کیسے جانا کہ پہلے ہرنی گئی ہے۔ اس کے بعد نر ہرن، پھر کوتوال، کوتوال کے بعد وزیر اور بادشاہ یعنی میں، آپ سے مخاطب ہوں۔''

اندھے نے ادب سے کہا ''بادشاہ سلامت! میں آنکھ کا اندھا ہوں، عقل کا نہیں۔ خدا کو دیکھا نہیں لیکن عقل سے پہچانا ہے۔''

بادشاہ نے کہا ''ہاں! یہ تو سچ ہے مگر یہ بتایئے کہ یہ تفصیل آپ کو کیسے معلوم ہوئی۔''

اندھا بولا ''بادشاہ سلامت! مادہ ہرن اور نر ہرن کو جہاں تک پہچاننے کا سوال ہے تو یہ بہار کا موسم ہے اور یہی ہرنوں کی مستی کا موسم ہوتا ہے۔ اس موسم میں نر مادہ کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ مادہ ہمیشہ آگے چھلانگیں بھرتی جاتی ہے اور نر اس کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ رہا سوال انسانوں کو جاننے کا اور انھیں پہچاننے کا تو اس کی پہچان اس کے بولنے کے انداز سے ہوتی ہے۔ پہلے جو سوار گزرا اس نے بدتمیزی کے ساتھ 'ابے تبے' سے اپنی بات شروع کی اور ناحق دو چار صلواتیں سنا دیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عام آدمی کے بولنے کا انداز نہیں بلکہ پولس والوں کا ہے۔ ان کی زبان سخت اور بولنے کا انداز جاہلانہ اور جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو آئے ان کے لہجے میں رعب و تحکم ضرور تھا لیکن انداز شریفانہ تھا۔ میں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ وزیر صاحب ہوں گے۔ اس کے بعد آپ تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ کچھ سپاہی بھی ہیں۔ جو درخت جتنا پھل دار ہوتا ہے اتنا ہی جھکتا ہے۔ آپ نے جس نرمی سے مجھے مخاطب کیا میں سمجھ گیا کہ ایسا میٹھا لہجہ کسی بادشاہ ہی کو زیب دیتا ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو بادشاہ سلامت کہہ کر مخاطب کیا اور میرا ندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔''

اندھے کی بات سن کر بادشاہ خوش ہوگیا۔ جاتے جاتے اس نے اندھے کو انعام واکرام سے نوازنا چاہا لیکن اندھے فقیر نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔ اس نے کہا ''بادشاہ سلامت! میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ بہت سکون اور آرام کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اس مال وزر کے سبب میرا سکون اور آرام ختم ہوجائے گا۔ ہمیشہ چوراچکوں کا ڈر لگا رہے گا اور جان کا بھی خطرہ رہے گا۔ آپ یہ دولت میری طرف سے کسی ضرورت مند کو دے دیجیے گا۔ اس کا بھی بھلا ہوجائے گا اور ہمیں بھی ثواب حاصل ہوگا۔''

■

Mojibur Rahman (Jahangir Uns)
At: Ranipur
P.O: Barlaria
Distt: Siwan - 841232 (Bihar)
Mob.: 9162357830

پرویز احمد یعقوبی

ایثار و سخاوت

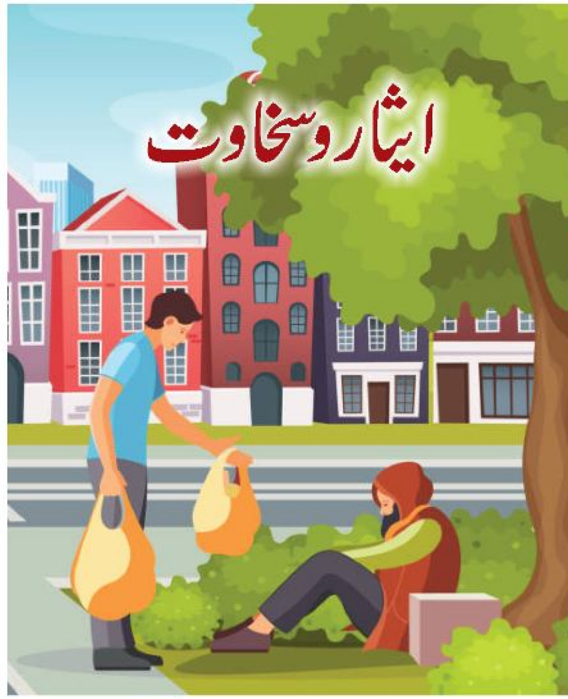

کورونا کی وجہ سے جاری لاک ڈاؤن میں گھر میں قید رہنے کے بعد کئی دوست آج گھر سے باہر نکلے اور ایک دوسرے سے ملاقات کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے۔

''السلام علیکم!'' گیٹ کھول کر جیسے ہی عرفان گھر میں داخل ہوا پیچھے سے آواز آئی۔

''وعلیکم السلام۔''

''جی، خیریت سے ہو!'' عرفان نے اخلاقاً جواب دیا۔

''جی!'' دونوں نے جواب دیا۔

''ہم دونوں مزدور ہیں، کام کی تلاش میں نکلے تھے صبح سے کوئی کام نہیں ملا۔''

''کئی دنوں سے یہی حال ہے۔'' دونوں نے اپنا حال بیان کیا۔

''میرے بچے رات سے بھوکے بیٹھے ہیں اور گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' ایک مزدور نے کہا۔

''میں بھی اس کے ساتھ ہی صبح سے کام کی تلاش میں گھوم رہا ہوں لیکن مزدوری کا کوئی کام نہیں ملا۔'' دوسرے مزدور نے بھی اپنا حال سنایا۔

عرفان سوچ میں پڑ گیا کہ کتنا راشن تقسیم ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ نقدی بھی دے رہے ہیں لیکن یہ بیچارے پھر دروازے پر آن کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نظر انداز کرنا چاہا لیکن خاموش رہا۔ سیلری نہ ہونے کے سبب وہ بھی مالی طور پر مضبوط نہیں تھا۔ خیال آیا کہ ان کو دس بیس روپے دے کر فارغ کر دے۔ جب سے لاک ڈاؤن شروع ہوا ہے سب لوگوں نے حسب حیثیت مل جل کر اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر غریبوں کے گھروں میں راشن کے پیکٹ بنا کر پہنچا دیے تھے۔

''صاحب! میرے بچے گھر میں بھوکے ہیں!'' پہلے مزدور نے دوبارہ فریاد کی۔

''آپ دونوں بھائی ہو کیا؟'' عرفان نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ہم روزانہ ایک ہی جگہ پر مزدوری کے لیے جمع ہوتے ہیں۔''

''ہم دونوں الگ الگ جگہ رہتے ہیں۔'' دوسرے مزدور نے جواب دیا۔

عرفان حیران تھا کہ اب کیا کرے۔ دس بیس والا معاملہ نہیں تھا جو فارغ کر دے۔ اس نے اپنا پرس ٹٹولا اس میں سے کچھ رقم نکل آئی۔ اس نے رقم کو کانپتے ہاتھوں سے آدھی آدھی کر کے دونوں کو دے دی اور دروازے میں داخل ہو گیا۔ تبھی ذہن میں خیال آیا کہ اس کے ساتھ جھوٹ تو نہیں بولا، دروازے والی کھڑکی کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

شکریہ اور دعائیہ کلمات کہتے ہوئے دونوں مزدور بھی اپنی راہ ہو لیے۔

''ارے بھائی سنو!'' مزدور نے اپنے ساتھی کو آواز دی۔

"یہ لو۔اپنے بچوں اور تمھارے کھانے کا انتظام کرلو۔ میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔" دوسرے مزدور نے اپنی رقم پہلے مزدور کے حوالے کرتے ہوئے کہا اور سائیکل پر سوار آگے بڑھ گیا۔

یہ منظر دیکھ کر عرفان اپنی نظروں میں شرمندہ ہو رہا تھا۔

"یہ تو فیصلہ کرنے میں مجھ سے زیادہ ثابت قدم اور ہمت والے نکلے۔"

"کیا کمال کا ایثار اور سخاوت کا جذبہ تھا ان مزدوروں میں۔"

" اللہ جانے دوسرے مزدور کو کوئی مدد ملی یا نہیں۔" عرفان گھر میں بیٹھ کر اسی سوچ میں گم تھا۔

ان دونوں مزدوروں کی طرف دیکھ کر احساس ہوا کہ بے شک یہ غریب مزدور تھے، ضرورت مند بھی تھے، گھر گھر دروازے پر پیشہ ور فقیروں کی طرح دستک دے کر مدد کا مطالبہ کر رہے تھے، اپنے بچوں کے لیے مدد کا سوال کر رہے تھے۔ لیکن کچھ مدد مل جانے پر انھوں نے کس طرح ایک دوسرے کو ترجیح دی۔ میرا دین اسلام یہی سبق دیتا ہے۔

کیا ہم نے اپنے طور پر کوئی ایسا کام کیا؟ اگر نہیں کیا تو ضرور کریں۔

■

Parvez Ahmed Yaqubi
Peeli Haveli Chowk
Kamptee- 441001
Nagpur (Maharashtra)
Mob.: 9595559073
parvezahmed.sana@gmail.com

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

Email.: magazines@ncpul.in , 011-26108159: فیکس 011-26109746:فون

دستخط

سندربن نام کا ایک جنگل تھا، وہ اپنے نام کی طرح ہی خوبصورت تھا۔ وہاں کے سارے جانور آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ جنگل میں ہر طرح کے پھول اور پھل کے درخت تھے، جنگل میں ایک تالاب اور کنواں بھی تھا، جس پر سبھی جانور ہاتھی، شیر، بلی، خرگوش، چوہا، بندر پانی پیتے، کسی کو کسی سے کوئی ڈر نہیں تھا۔

ایک بار بارش کم ہوئی جس سے تالاب سوکھنے لگا، سبھی جانور پریشان ہوگئے کہ اگر تالاب سوکھ گیا تو کیا ہوگا۔ دھیرے دھیرے تالاب سوکھ گیا سبھی جانور پانی کے لیے پریشان ہوگئے۔ کچھ جانوروں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جنگل چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں جہاں پانی ہو۔ جنگل کا بادشاہ شیر اور کچھ جانور اپنا گھر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے انہیں اپنا گھر بہت عزیز تھا۔

ایک دن جنگل کے بادشاہ شیر نے سبھی کو بلا کر کہا پانی کی کمی سے ہم سب پریشان ہیں۔ اس پریشانی سے نکلنے کے دو راستے ہیں، ایک تو یہ کہ ہم سب جنگل چھوڑ کر جہاں پانی ہو وہاں چلے جائیں اور جب بارش ہوگی، تالاب بھر جائیں گے تو ہم سب واپس اپنے گھروں کو آجائیں گے۔ دوسرا یہ کہ کیوں نہ ہم سب مل کر کھدائی کرتے ہوئے ایک نہر ندی سے تالاب تک لائیں۔ کچھ جانوروں نے بادشاہ کی نہر بنانے والی بات سے اتفاق کیا اور کچھ نے انکار کر دیا۔ چنو اور منو خرگوش بہت پریشان تھے وہ اپنا گھر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے اور نہ ہی یہ چاہتے تھے کہ جنگل کا کوئی بھی جانور اپنا گھر چھوڑ کر جائے۔

جنگل میں تالاب سے کچھ قدم کی دوری پر کنواں تھا، پانی کی کمی کی وجہ سے کنویں کا پانی کافی نیچے چلا گیا تھا۔ پانی کی سطح نیچے چلے جانے سے جانور پانی نہیں نکال پا رہے تھے۔ شام کے وقت جب ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تب کچھ چور آئے اور

کنویں کے پاس بیٹھ کر چوری کیا ہوا مال آپس میں بانٹنے لگے اور پھر کنویں سے پانی نکال کر پیا اور کنویں کے پاس ہی آرام کرنے لگے۔

یہ سب چنو خرگوش دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر چنو کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور منو کو بلا کر لایا اور اس سے کہا کہ کیا کرنا ہے۔ دونوں کنویں کے پاس پیڑ کے پیچھے چھپ کر زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ چنو نے منو سے کہا' پتہ ہے منو...... کل رات کچھ ڈاکو جنگل آئے تھے۔ ان کے پاس بہت سارا مال تھا۔ ان ڈاکوؤں نے لوٹ کا سارا مال ایک چھوٹے سے صندوق میں رکھ کر کنویں میں پھینک دیا تاکہ ان کا مال محفوظ رہے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے'

ڈاکوؤں نے چنو منو کی باتیں سن لیں اور دولت کی لالچ میں کنویں کے پاس آئے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا کنویں میں پھینکا یہ جاننے کے لیے کہ کنویں کے اندر کچھ ہے کہ نہیں۔ پتھر کا ٹکرا جب کنویں کے اندر پتھر سے ٹکرایا تو ایک آواز آئی۔ آواز سن کر چور بہت خوش ہوئے اور انھیں لگا کہ پتھر صندوق سے ٹکرایا ہے۔ چور اپنے ساتھیوں کو لینے چلے گئے۔

کچھ دیر کے بعد چور اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئے۔ ایک چور بولا ''ڈاکوؤں نے سارے مال و دولت کو کنویں میں اس لیے چھپایا ہوگا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے'' تبھی دوسرا چور کنویں میں جھانکتے ہوئے بولا: ہمیں صندوق نکالنے کے لیے کنویں کا پانی نکالنا ہوگا۔ ویسے بھی قحط پڑا ہوا ہے زیادہ پانی نہیں ہوگا۔ جب پانی کم ہو جائے گا تب کنویں میں اتر کر صندوق نکال لیں گے۔

چاروں چوروں نے مل کر کنویں کا پانی نکالنا شروع کیا۔ ایک چور پانی کھینچتا تو دوسرا چور اسے تالاب میں جانے والی نالی میں ڈال دیتا۔ اس طرح چاروں چور مل کر پانی نکالتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ مگر وہ چاروں چور پانی نکالنے میں ابھی تک مصروف تھے۔ اور تالاب اچھا خاصا پانی سے بھر چکا تھا۔

صبح ہوتے ہی چنو منو تالاب کے پاس آئے اور تالاب کو پانی سے بھرا دیکھ کر چوروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولے: چور بھیا..... آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ.. آپ سب کی محنت سے تالاب پانی سے بھر گیا۔ اور ہاں... ایک بات اور اس کنویں میں کوئی خزانہ نہیں ہے اور نہ ہی یہاں کوئی ڈاکو آئے تھے۔ ہم دونوں نے آپ لوگوں سے پانی نکلوانے کے لیے جھوٹ بولا تھا کہ کنویں میں خزانہ ہے۔ چنو منو کی باتیں سن کر چاروں چور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ دولت کی لالچ میں کس طرح بیوقوف بن گئے۔ تبھی چنو منو نے جا کر جنگل کے سبھی جانوروں کو یہ خوش خبری سنائی کہ تالاب پانی سے بھر گیا ہے۔ اب ہمیں اپنا گھر اور یہ جنگل چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سبھی جانور چنو منو کی باتیں سن کر تالاب کے پاس آئے اور تالاب کو پانی سے بھرا دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے۔ شام کو بادشاہ شیر نے چنو منو کی زبانی پوری کہانی سنی اور ان کی سوجھ بوجھ کی تعریف کرتے ہوئے دونوں کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اس طرح سبھی جانور چنو منو کی سمجھداری سے اپنا گھر چھوڑنے سے بچ گئے۔

تو پیارے بچو! ہمیں کبھی بھی مصیبت سے بھاگنا نہیں چاہیے بلکہ سب کو مل کر اس کا سامنا کرنا چاہیے۔

■

Dr. Sadia Parveen
D/O Afzal Ahmad Ujala
Chhattar Pura Mau Nath Bhanjan
Dist Mau- 275101 (UP)
Mob.: 7599246348
Email.: sadiaparveen2015@gmail.com

کہانی

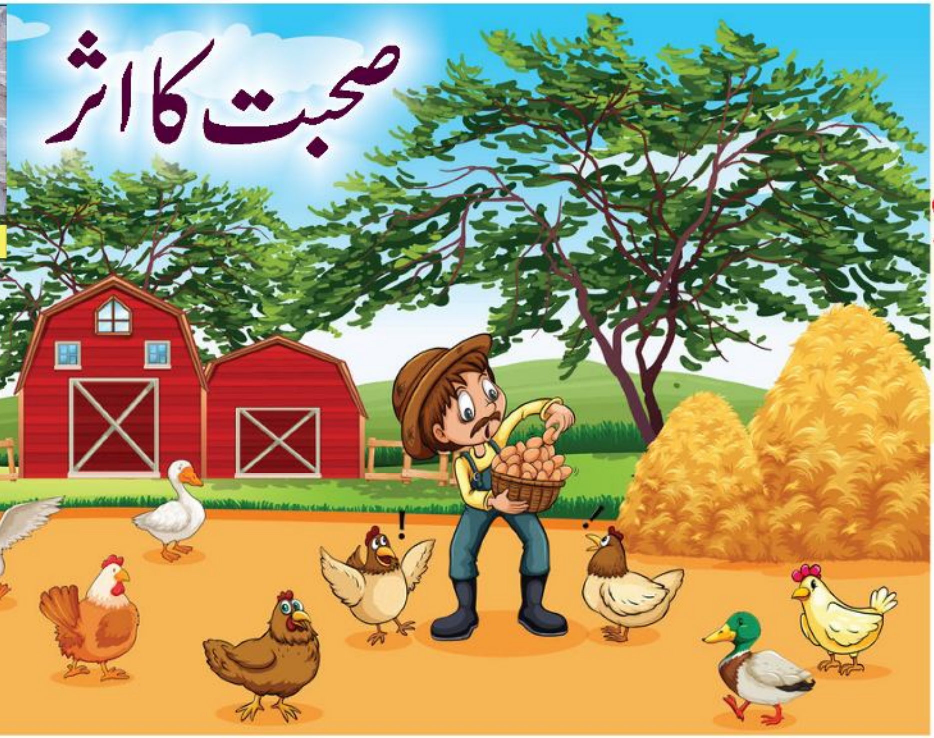

صحبت کا اثر

متین الدین

حامد کو پرندوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے پڑھنے لکھنے کے بعد کا سارا وقت کبوتروں اور مرغی بچوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ سارا دن ان کی دیکھ بھال میں گزار دیتا وہ خود بھی ان میں پرندکی طرح مشغول ہو جاتا۔ جیسے ان سے انھیں کی زبان میں باتیں کر رہا ہو۔ ایک دن حامد نے ایک نیا کام یہ کیا کہ کبوتروں کے انڈے ہٹا کر ان کے نیچے مرغی کے انڈے رکھ دیے۔ کبوتر انھیں اپنے ہی انڈے سمجھ کر سینے لگے اور بیس بائیس دن کے بعد انڈوں میں سے چوزے نکل آئے۔ کبوتر انھیں اپنے ہی بچے سمجھ کر اپنی چونچ سے چگا کھلانے کی کوشش کرتے لیکن چوزوں کی فطرت تو کبوتروں سے جدا تھی۔ چوزے تو خود ہی انڈوں سے نکل کر کبوتروں کی دیکھ ریکھ میں آپ ہی دانہ چگنے لگے۔ کبوتر اپنی فطرت کے مطابق اپنی چونچ کا دانہ چوزوں کی چونچ میں ڈالنا چاہتے۔ یہ صحبت کا اثر تھا یا کبوتروں کی تربیت چوزے بڑے ہو کر بھی کبوتروں کے ماحول میں رنگے ہوئے تھے اور اپنے مرغ نسل کے ماحول کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے لیکن فطرت کا سماجک ماحول اثر انداز ہونے لگا اور اپنے ہی فطرت کے ماحول میں رنگ لیا لیکن چوزوں کو بڑا ہو کر بھی یہ اپنا ماحول پسند نہ تھا۔ بچوں کو پالنے کی ذمے داری بھی دونوں نر مادہ کی برابر تھی۔ مادہ مرغی نے تو اپنا ارادہ بالکل بدل لیا تھا کہ میں اپنے پریوار بچوں کو اس ماحول میں پرورش نہیں ہونے دوں گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مادہ مرغی کا پریوار بڑھنے لگا۔ اور یہ فکر بھی بڑھنے لگی کہ بچوں کو کیسے اس ماحول سے پاک کیا جائے۔ یکایک خیال آیا کیوں نہ میں اپنے بچوں کا داخلہ اس مکتب میں کراؤں جہاں ادب والے پرندوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ تلاش کرنے پر مادہ مرغی نے یہی کیا اپنے بچوں کو اسی اسکول میں لے گئی جہاں جوڑے بنا کر رہنے والے پرندوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کے آفس پہنچ کر گفت وشنید ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر نے پیسوں کے لالچ

میں داخلہ لے لیا۔ ہیڈ ماسٹر نے بچوں کا نام پوچھا۔ ماں کا نام پوچھا۔ باپ کے نام پر مرغی شرما گئی اور کہنے لگی ان کی سب کچھ میں ہی ہوں۔ ہیڈ ماسٹر نے خاموشی کے ساتھ تعجب بھری نظروں سے مرغی کو دیکھا۔ خیر ہیڈ ماسٹر کو ف داخلہ لینا تھا لے لیا۔ مرغی کے بچوں کا داخلہ اسکول میں چرچا کا موضوع بن گیا تھا۔ کچھ پرندے احتجاج پر اتر آئے کہ یہ تو ہماری تہذیب و ثقافت کا جنازہ نکال دیں گے۔ احتجاج ہیڈ ماسٹر تک جا پہنچا لیکن ہیڈ ماسٹر نے اپنے موقف سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً یہ بات سارے صحرا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سارے اسکول احتجاج پر اتر آئے ۔ اسکول بند ہونے لگے۔ یونیورسٹیاں بند ہونے لگیں۔ سارے صحرا میں بس یہی چرچا تھا کہ مرغی کے چوزوں کا داخلہ نہیں چلے گا یہ احتجاج جب اسکولو ں سے نکل کر گھر گھونسلو ں اور پیڑوں کی ڈالیوں سے ہوتا ہوا صحرا کی پگڈنڈیوں پر آ گیا تو دوسرے انفرادی آزاد زندگی گزارنے والے جانور اور پرندوں میں بھی ابال آ گیا کہ صحرا میں یہ امتیاز کیسا۔ صحرا کے ہم سب جانور چرند پرند ایک ہیں۔ یہ انسانوں والا امتیاز یہاں صحرا میں نہیں چلے گا۔ اعلیٰ و ادنیٰ کا کالے اور گورے کا ذات برادری کا انسانی انتشار یہاں صحرا میں پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ اب یہ احتجاج دو طرفہ جوڑے بنا کر زندگی گزارنے والے جانور پرند بنام انفرادی آزاد زندگی گزارنے والے ہو گیا دونوں فریق اپنی اپنی مانگیں منوانے پر بضد تھے اور اپنی انا کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ بات بڑھتی گئی یہاں تک کہ بات شیر راجا کے دربار تک جا پہنچی۔

صحرا کے اس انتشار سے شیر راجا فکرمند ہو گیا اور مسئلے کو سلجھانے کے لیے صحرا کے تمام جانور چرند پرند کو دربار میں آنے کی دعوت دی۔ بادشاہ کا دربار سجنے لگا۔ مشاورتی وزراء بادشاہ کے ساتھ تخت نشیں ہوئے۔ جج اور پیشکار نے اپنے قلمدان سنبھال لیے۔ فوج نے نگرانی کا انتظام پوری مستعدی سے سنبھال رکھا تھا۔ وکلاء اپنی اپنی دلیلیں دینے کے لیے اگلی ہی صف میں کھڑے تھے۔ پیچھے دربار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آخر کار دربار کی کارروائی شروع ہوئی۔

طوطے میاں نے اپنی مدھر آواز میں اپنی کارگزاری کو آگے بڑھایا۔ سرکار ہم سب جانور چرند پرند زمین پر قدرت کے دیے ہوئے انمول رتن ہیں جو کائنات میں صحرا کی فضا کو پر رونق بنائے ہوئے ہیں۔ ایک ساتھ رہنے کے باوجود ایک آڑ سے اپنی اپنی ثقافتی حد میں رہتے ہیں۔ قدرت نے جس کو بھی جس فطرت سے نوازا ہے وہ اسی میں مگن ہے۔ لہٰذا مرغی کے چوزوں کی فطرت ہماری فطرت تہذیب سے میل نہیں کھاتی۔ اس لیے ہم اپنے بچوں کے اسکول میں مرغی کے چوزوں کا داخلہ نہیں چاہتے۔

مٹھو میاں کی بات ختم ہوتے ہی دوسری طرف کے چار وکلا آگے بڑھے۔ مرغے نے وکالت کی کارگزاری شروع کی۔ سرکار صحرا کی یہی ایک خاص ثقافتی وراثت تھی کہ ہم جنگل میں بلا امتیاز نسل کے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ صحرا کی اس نشانی کو ہم مٹنے نہیں دیں گے اور تہذیب کے نام پر ہم صحرا کا بٹوارہ نہیں ہونے دیں گے۔ کتے اور بکرے نے بھی کچھ اسی طرح کی وکالت کی اور بیل تو آخر میں بیل ٹھہرا۔ اپنے سینگ زمین میں گاڑ کر اور مٹی کو سینگوں سے اچھال کر بولا سارے جنگل کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا لیکن تہذیب کے نام پر جنگل کا بٹوارہ نہیں ہونے دوں گا۔ چاروں وکلا کی تقریر ختم ہوتے ہی چھوٹی گوریا آگے بڑھی اور اپنی شائستہ آواز میں چیں چیں کرتی ہوئی بولی حضور یہ مرغا، کتا بکرا اور بیل واقعی ان جیسوں کا جنگل میں دبدبہ قائم ہے۔ طاقت کے نام پر جنگل میں غل مچا رکھا ہے لیکن قومی ہمدردی کے نام پر تو یہ زیرو ہیں پھر انھیں ہیرو کس نے بنا

دیا۔ ان کی بے غیرتی کا عالم یہ ہے کہ یہ مرغا جو اپنی آواز میں ڈینگیں مار رہا ہے اپنی شہزوری کی وجہ سے بدنام ہے۔ مجال ہے جو ایک بچے کو بھی دانا چگا دے۔ بیچاری مرغی پہلے تو انڈے دینے میں ہلکان ہوجاتی ہے اور پھر بیس دن تک مسلسل انڈوں کو گرمی دے کر اپنے آپ کو بیمار جیسا بنا لیتی ہے اور جب اس میں بچے نکل آتے ہیں تو چوزوں کو چگاتی پھرتی ہے۔ آپ نہیں کھاتی اور بچوں کو چن چن کر کھلاتی ہے۔ کیا مرغے پر یہ حق نہیں بنتا کہ وہ بھی اپنے بچوں کو پالے۔ یہی حال بیچاری کتیا کا ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کے لیے اپنی زندگی قربان کردیتی ہے۔ تقریباً یہی حال بکرا اور بیل کا بھی ہے جو اپنے بچوں کے پالنے میں شریک نہ ہوں وہ قوم کی وکالت ہمارے سامنے کریں ہم میں اور ان میں بس یہی فرق ہے کہ ہم جوڑے بنا کر رہتے ہیں تو بچوں کے پالنے کی ذمے داری بھی ہم دونوں برابر نبھاتے ہیں۔ یہ آزاد انفرادی زندگی گزارتے ہیں تو ان کے بچے صرف مادہ پالتی ہے۔ یہ فرق ہی ہمیں اس معاشرے سے جوڑتا ہے جس میں حیا ہے، شرم ہے ادب اور تہذیب ہے۔

گوریا کی وکالت سارا دربار اس طرح سن رہا تھا جیسے کوئی چھپی ہوئی حقیقت پردوں سے باہر آ گئی ہو۔

جج صاحب چاروں وکلا سے مخاطب ہوئے کہ کچھ کہنا چاہو گے۔ چاروں وکلا نے گوریا کی باتوں سے اتفاق کیا اور بولے سرکار ہماری نسلوں کا تخلیقی وجود اس فطرت کے خلاف ہے جس میں نر بھی اپنے بچوں کو پالنے میں برابر کا شریک ہے۔ جب ہمیں علم ہی نہیں تخلیق ہونے والا بچہ کس نر کا ہے تو فطرت کو کیسے ان بچوں پر پیار آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بچوں کو پالنے میں بالکل بھی شریک نہیں ہیں۔

تب مادہ مرغی آگے بڑھ کر عرض کرنے لگی سرکار میں اپنے اسی ماحول سے تو تنگ آ کر کبوتروں کی صحبت اور تربیت سے سبق لے کر میں اپنے پریوار کو بدلنا چاہتی ہوں سرکار سے گزارش ہے کہ میرے بچوں کو اسکول میں داخلے کی اجازت دی جائے۔

ایک پرانا بزرگ کبوتر آگے بڑھا تخت نشین بادشاہ جج مجسٹریٹ وانتظام اور تمام سامعین وفریقین کا اپنے انداز میں آداب کے ساتھ جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے گویا ہوا 'تخم تاثیر صحبت کا اثر' سرکار تخم اپنی فطرت نہیں بدل سکتا جس فطرت پر پیدا ہوتا ہے وہی تاثیر رکھتا ہے۔ البتہ صحبت کا اثر ضرور اثرانداز ہوتا ہے لیکن ایک حد تک جب تک صحبت کا اثر باقی رہتا ہے۔ دیکھیے کچھ انسان اپنے منفی تخیل کے غلام ہوگئے ہیں اور اس غلامی کے طوق نے انسان کو اتنا بگاڑ دیا ہے کہ انسانی تخلیق کے پاک رشتے کے برعکس کام کرنے لگا ہے اور شادی بیاہ کے پاک بندھن سے خوف کھانے لگا ہے۔ انفرادی آزاد زندگی کو اچھا سمجھنے لگا ہے۔ انسان کو ہم سے عبرت حاصل کرنی چاہیے تھی لیکن انسان سے ہمیں عبرت محسوس ہو رہی ہے۔ اگر ہم نے بھی تہذیب وثقافت کو خلط ملط کرلیا تو قدرت کا ہم پر بھی قہر ٹوٹ پڑے گا۔ لہٰذا بھائیو ہم سب صحرائی بھائی ہیں اور ہمیں سب کو ایک ہی جگہ رہنا ہے لیکن قدرت کے اصول وضوابط کی آڑ سے ایک حد میں رہنا ہے۔ کبوتر کی تقریر قدرت کے الہام سے کچھ کم نہ تھی سارے سامعین فریقین پرند جانور جج بادشاہ سب مطمئن ہوگئے اور اپنے اپنے احتجاج واپس لے لیے۔ بادشاہ نے بھی خوش ہو کر دربار کی کارگزاری کے اختتام کا اعلان کردیا۔

■

Matinuddin
T & P.: Umri Kalan
Distt.: Moradabad - 244501 (UP)
Mob.: 9690287383

فیاض احمد

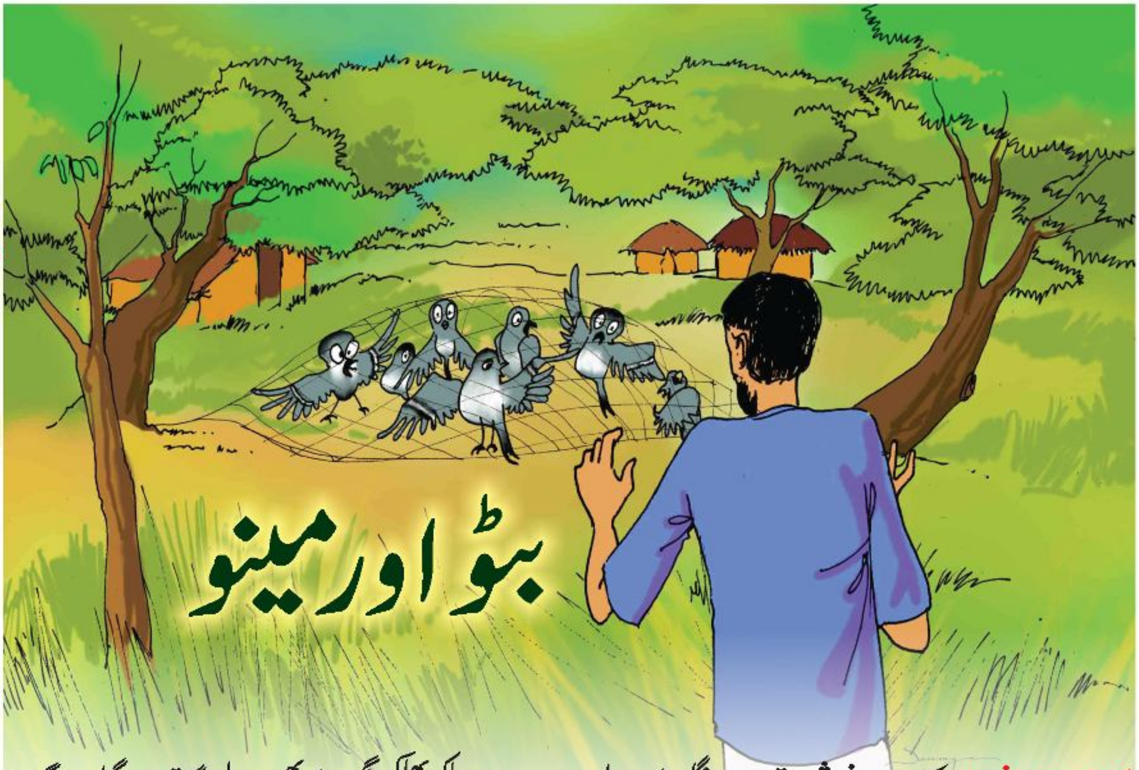

بٹو اور مینو

کرامت شیخ ایک پرندہ فروش تھے۔ وہ جنگل میں جال بچھاتے اور چڑیوں کو پکڑتے۔ رنگ برنگ کی چڑیوں کو پکڑنا اور ان کو پنجرے میں بند کر کے بیچنا ان کا پیشہ تھا۔ ایک دن ان کے جال میں دوسرے پرندوں کے ساتھ ایک نایاب پہاڑی مینا بھی پھنس گیا۔ وہ جب سارے پرندوں کو گھر لے آئے تو جمیلہ بیگم نے مینا کو دیکھ کر کہا: ارے واہ! یہ تو بہت ہی خوبصورت پرندہ ہے اسے ہم اپنے گھر میں ہی رکھیں گے، بیچیں گے نہیں۔ بٹو بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بٹو ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ کرامت شیخ اور جمیلہ بیگم بٹو سے بہت پیار کرتے تھے وہ ان کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔

بٹو ابھی ڈھائی برس کا ہے اور ہلکی پھلکی باتیں بھی کرتا ہے مگر وہ مینا تو انسانوں جیسی صاف صاف باتیں کرتا تھا۔ سب دیکھ کر حیران رہ جاتے۔

بٹو اور مینا بہت جلد گہرے دوست بن گئے۔ بٹو کی مدد سے وہ مینا ہلکی پھلکی انگریزی بھی بولنے لگا تھا جیسے گڈ مورننگ، تھینک یو، ہیلو وغیرہ۔ بٹو اس کو دس تک کا پہاڑہ بھی یاد کروا چکا تھا۔ بڑا ہوشیار تھا بٹو کا مینو۔

اور بٹو چھ برس کا ہو گیا اور اب اسکول بھی جانے لگا تھا۔ بٹو ایک نیک دل لڑکا بنا دوسروں کی مدد کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔ پڑوس کے چچا جمن کا پانی بھرنا اور موٹی چاچی کا پان لا دینا تو جیسے اس کا روز کا معمول تھا۔

ایک دن اس کے دل میں جانے کیا آیا کہ اس نے 15 اگست کے دن مینا کو آزاد کر دیا۔ آزادی کسے پسند نہیں۔

مینا پھر سے اڑ کر جنگل کی طرف چلا گیا۔

کرامت شیخ نے دیکھا تو غصے میں کہا:

''ارے یہ کیا پرندہ اڑا دیا تم نے اِس کے تو 5 ہزار ایسے ہی مل جاتے۔'' بٹو نے جھٹ سے کہا:

''آزادی سب کا حق ہے، آج اسکول میں پندرہ اگست

کے پروگرام میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے سمجھایا ہے ہمیں۔

ارے لیکن بیٹا.... خیر جانے دو کرامت شیخ نے کہا۔

ایک دن جب کرامت شیخ جنگل کی طرف جا رہے تھے تو بٹو بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ لیکن ان کے والد نے سمجھایا: ارے بیٹا جنگل میں تو بہت طرح کے خطرے ہوتے ہیں چور ڈاکو، جنگلی جانوروں کا بھی خطرہ ہوتا ہے مگر بٹو ضد لے کر بیٹھ گیا۔ خیر اس دن دونوں جنگل کو گئے اور وہاں جنگل میں پہنچ کر انھوں نے ایک جال بچھا دیا اور دونوں چڑیوں کے پھنسنے کا انتظار کرنے لگے۔ اچانک وہاں پر کچھ بدمعاش آ گئے اور ان کے اوپر حملہ کر دیا ان سے لڑتے ہوئے کرامت شیخ زخمی ہو گئے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب کچھ دیر کے بعد انھیں ہوش آیا تو ان کے اوپر قیامت ٹوٹ پڑی کیونکہ اس کا لاڈلا بیٹا بٹو آس پاس نہیں تھا وہ سمجھ گیا کہ وہ غنڈے بدمعاش ضرور ان کے بیٹے کو اٹھا کر لے گئے ہوں گے وہ لہولہان کسی طرح اپنے گھر پہنچے جمیلہ بیگم کا انھیں دیکھ کر بہت برا حال ہوا اور انھوں نے بٹو کے بارے میں پوچھا تو وہ رونے لگے اور کہنے لگے کہ کچھ بدمعاشوں نے ان پر حملہ کیا اور بٹو کو اٹھا کر پتہ نہیں کہاں چلے گئے جمیلہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا ور فیصلہ کیا کہ اس کی رپورٹ پولیس چوکی میں لکھا دی جائے۔ دونوں گئے اور پولیس چوکی میں بٹو کے گم ہونے کی رپورٹ لکھوا دی۔ وہاں کا آفیسر بڑا ہی اچھا تھا انھوں نے کہا: ''اس طرح کے کئی واقعات یہاں پیش آ رہے ہیں اور یہ کسی بچہ پکڑنے والے گینگ کا کام لگتا ہے۔ خیر آپ گھبرائیں نہیں، آپ جائیں اور ہم پر بھروسہ رکھیں ہم ضرور بٹو کو ڈھونڈ نکالیں گے آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں واپس گھر آ گئے۔

بدمعاشوں نے بٹو کو کالی پہاڑی پر قید کر رکھا تھا۔ اس پہاڑی پر اور بھی کئی بچے قید تھے۔ ادھر جمیلہ بیگم کا رو رو کر برا

حال تھا کہ ان کے بچے کی کوئی خبر نہیں ملی۔ دونوں میاں بیوی بٹو کو جگہ جگہ تلاش کرتے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ بٹو کہاں گیا؟

اسی طرح ایک سال گزر گیا پولیس میں بھی شکایت درج کرائی تھی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ایک دن اچانک کالی پہاڑی پر بٹو کی نظر ایک پنجرے پر پڑی جس میں ڈھیر سارے پرندے بند تھے۔ ایک خاص کمرے میں ڈاکوؤں کے سردار کی بیٹی ان سے کھیلا کرتی تھی۔ بٹو کو اپنا بچپن یاد آ گیا کہ کیسے وہ بھی اپنے پیارے مینو کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ قیدی کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ اتفاق دیکھیے کہ پرندوں کی جھنڈ میں وہ بدنصیب بوڑھا مینا بھی قید تھا۔

سردار کی بیٹی نے ایک دن بٹو سے کہا کہ چڑیوں کو دانہ پانی دے دو۔ انسان کی نیکی اس کے کام آتی ہے خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس پہاڑی مینا کو بٹو بہت ہی اچھے طریقے سے یاد تھا۔ اچانک پنجرے سے کوئی بولا ''بٹو بٹو۔'' سردار کی بیٹی تو ایک دم چونک گئی۔ آواز سنتے ہی بٹو سمجھ گیا کہ یہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کے بچپن کا دوست مینو ہے جسے برسوں پہلے اس نے آزاد کیا تھا مگر وہ خاموش رہا اور انجان بنا رہا۔ اس نے کہا نہیں نہیں یہ کوئی بٹو بٹو نہیں بلکہ مٹھو مٹھو کی رَٹ لگا رہا ہے۔ شہزادی نے کہا ہو سکتا ہے، یہاں بہت سارے طوطے بھی قید ہیں اور پرندے انسانوں جیسی باتیں کہاں کرتے ہیں۔

ایک دن موقع پا کر بٹو نے مینو سے کہا میں بٹو ہوں تم نے مجھے پہچان لیا۔ بہت خوب تمھاری یادداشت غضب کی ہے تھینک یو بٹو۔

بٹو نے کہا: ارے چپ ہو جاؤ میرے دوست انھوں نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔

بٹو نے مینا سے کہا: میں تمھیں آزاد کر دیتا ہوں تم میری آزادی کا سامان کر دو، میرے گھر کا پتہ معلوم ہے نہ جا کر میرے والد کو میرے بارے میں سب بتلا دو اور کہہ دو کہ یہاں کا برا حال ہے کہ وہ پولیس کو لے آئیں اور بدمعاش کو پکڑ کر لے جائیں۔ بٹو نے چپکے سے مینا کو پنجرے سے نکال کر اڑا دیا اور بقیہ چڑیوں سے کہا: ''تم سب کو بعد میں آزاد کرا دوں گا ایک ساتھ سب گئے تو مجھے مار ڈالیں گے یہ لوگ۔'' مینا سیدھا بٹو کے گھر گیا اور سارا حال سنا دیا۔ کرامت شیخ مینا کے ہمراہ پولیس اسٹیشن بھی گئے اور پولیس کو بدمعاشوں کے اڈے کی ساری جانکاری دے دی۔ پولیس مینو کے ساتھ کالی پہاڑی گئی۔ پولیس نے بہت بہادری سے بدمعاشوں کا مقابلہ کیا اور بڑی محنت کے بعد بدمعاشوں کو پکڑ لیا اور سیدھے جیل لے گئے اور تمام بچے قیدیوں کو چھڑا لیا گیا۔ بٹو نے سب سے پہلے پرندوں سے کیا وعدہ نبھایا اور سارے پرندوں کو آزاد کر دیا۔ پولیس نے سردار کی بیٹی جو محض آٹھ سال کی تھی اسے بٹو کے والد کے حوالے کر دیا کہ اس کی اچھی پرورش کریں۔

وہ پہاڑی مینا اب آزاد ہے اور اکثر بٹو کے گھر آتا جاتا رہتا ہے اور سب کا دل بہلاتا ہے۔ سردار کی بیٹی بھی ایک نیک دل لڑکی بن گئی اور وہ سب کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ بٹو کی نیکی اس کے کام آ گئی بلکہ کئی بچے جوان بدمعاشوں کی قید میں تھے سب آزاد ہو گئے اور اپنے والدین سے جا ملے۔ کرامت شیخ نے بھی پرندہ فروشی چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کر لیا۔

بچو! ہر مخلوق کو حق ہے کہ وہ آزاد رہے اور اپنی مرضی سے جیے، ہم سب آزاد ہیں اور کسی کو قید کرنا بہت بڑی برائی ہے۔ ■

Faiyaz Ahmad
South Bazar
PO.: Andal - 713321
Distt.: Paschim Bardhawan (W.B)

محمد اسلم تنویر

سی سی ٹی وی کیمرہ

یہ کہانی ان کے لیے ہے جو ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں اور اپنے والد کی نصیحتوں پر برا مان جاتے ہیں۔ آج کی یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ کی سوچ مکمل بدل جائے گی کہ والد کی نصیحتیں ہمارے لیے واقعی فائدے کے لیے ہوتی ہیں۔ جس طرح کھیتی کے لیے پانی ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح اولاد کی پرورش کے لیے والد کی ڈانٹ پھٹکار بھی ضروری ہے۔ ہر والد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔ اولاد جب ترقی کی سیڑھیوں پر آگے بڑھتی ہے تو اولاد سے زیادہ خوشی ان کے والدین کو ہوتی ہے۔ جب تک بچے اسکول کالج میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ان کی پہچان ان کے باپ کے نام سے ہوتی ہے کہ یہ فلاں صاحب کا لڑکا ہے یا فلاں صاحب کی لڑکی ہے۔ لیکن ہر والد کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر اتنی ترقی کر لیں کہ جب باپ گھر سے نکلے تو راستے میں لوگ کہیں دیکھو وہ فلاں انجینئر، فلاں ڈاکٹر، فلاں ٹیچر کے والد ہیں جنھوں نے اپنے بیٹے یا بیٹی کو اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ تمیز اور ادب بھی سکھایا ہے۔

ساجد کے والد بھی ساجد کو بہت نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ ساجد ان کی اکلوتی اولاد تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ غلط صحبت میں پڑ کر اپنی زندگی برباد کرے۔ ساجد کی پڑھائی مکمل ہو گئی تھی اور وہ ملازمت کے لیے در بہ در بھٹک رہا تھا۔ وہ بچپن سے لے کر جوانی تک اپنے والد کی نصیحتوں کو سنتا رہا اور ان پر عمل کرتا رہا۔ مگر اب والد کی نصیحتیں اسے زہر لگنے لگی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اب وہ بڑا ہو چکا ہے اور اسے اچھے اور برے کا بخوبی علم ہے۔

ساجد کو آج ایک آفس میں انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ وہ گھر سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر آج میں کامیاب ہو گیا اور یہ ملازمت مجھے مل گئی تو فوراً اپنا گھر چھوڑ دوں گا۔ والد صاحب کی روز روز کی نصیحتوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ صبح اٹھنے سے لے کر رات کو سونے تک ذرا ذرا سی بات پر والد صاحب کی نصیحت سن سن کر اکتا گیا ہوں، بیزار ہو گیا ہوں۔ صبح غسل خانے کی تیاری کرو تو حکم ہوتا ہے پہلے بستر کی چادر درست کرو، پھر غسل خانے جاؤ۔ غسل خانے سے نکلے تو فرمان جاری ہوتا ہے کہ نل ٹھیک سے بند کر دیا...؟ ٹاویل صحیح جگہ رکھا ہے یا یوں ہی پھینک دیا...؟ اتارے کپڑے واشنگ مشین میں ڈ

الے یا نہیں.... ؟ ناشتہ کر کے گھر سے نکلنے کی سوچو تو ڈانٹ پڑتی ہے کہ روم کا پنکھا لائٹ بند کیا یا نہیں.... ؟ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے.... ! کیا کیا سنیں یار.... ! نوکری ملے تو گھر چھوڑ دوں گا یہی سب سوچتے ہوئے وہ آفس میں داخل ہوا۔ آفس میں بہت سے امیدوار مینیجر کا انتظار کر رہے تھے، دس بج چکے تھے۔ ساجد نے دیکھا کہ آفس کی گیلری کی لائٹ ابھی تک جل رہی ہے۔ لائٹ جلتی دیکھ کر والد یاد آ گئے تو فوراً جا کر گیلری کی لائٹ بجھا دی۔ آفس کے دروازے پر کوئی نہیں تھا۔ بازو میں رکھے واٹر کولر سے پانی ٹپک رہا تھا تو اس نے فوراً والد صاحب کی ڈانٹ کو یاد کرتے ہوئے اس کو بند کر دیا غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا، اسے بند کیا تبھی اس کی نظر نوٹس بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا انٹرویو دوسری منزل پر ہے سیڑھی کی لائٹ بھی جل رہی تھی۔ اسے بند کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ ایک کرسی بیچ راستے میں تھی اسے راستے سے ایک طرف ہٹا کر اوپر گیا وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ اس سے پہلے ہی بہت سے امیدوار یہاں آ کر بیٹھ چکے ہیں۔ ساجد بھی وہاں بیٹھ گیا اور اپنے نمبر کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ وہاں موجود امیدوار ایک ایک کر کے اندر جاتے اور فوراً واپس آ جاتے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا اندر وہ درخواست لے کر کچھ پوچھتے ہی نہیں واپس بھیج دیتے ہیں۔ ساجد کا نمبر آنے پر اس نے اپنی فائل مینیجر کے سامنے رکھ دی تمام کاغذات دیکھ کر مینیجر نے پوچھا ڈیوٹی کب سے جوائن کر رہے ہو.... ؟ ساجد کو اپنے کانوں پر بھروسا ہی نہیں ہو رہا تھا کہ مینیجر صاحب نے اس سے ایسا کہا، وہ مینیجر صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا.... ! مینیجر صاحب نے اس کی بے چینی کو محسوس کر لیا اور کہا، ہاں یہ حقیقت ہے۔ آج کے انٹرویو میں کسی سے کچھ پوچھا ہی نہیں بلکہ سی سی ٹی وی پر تمھارا برتاؤ دیکھا ہے۔ سبھی امیدوار آئے مگر کسی نے نل یا لائٹ بند نہیں کی۔ مبارکباد کے مستحق ہیں تمہارے والدین کہ جنھوں نے تمھیں اچھی تعلیم و تربیت دی، تمیز اور تہذیب سکھائی جو شخص خود فیصلہ نہیں لے سکتا وہ چاہے جتنا ہوشیار اور چالاک ہو زندگی کی دوڑ میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سننے کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ والد صاحب جو نصیحتیں کیا کرتے تھے وہ اس کی بھلائی کے لیے تھیں۔ اس نے اسی وقت یہ طے کر لیا کہ گھر پہنچتے ہی وہ اپنے والد سے معافی مانگ کر انھیں یہ بتائے گا کہ آج وہ اپنی زندگی کی پہلی آزمائش میں ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر روکنے اور ٹوکنے کی وجہ سے کامیاب ہو گیا۔ آپ نے جو باتیں بتائیں ان کے سامنے اس کی ڈگریوں کی کوئی بھی قیمت نہیں۔

■

Mohd Aslam Tanveer
Salma Manzil, Lal Madarsa
Warispura
Kampti - 441001 (Maharashtra)
Distt.: Nagpur
Mob.: 9370033164

گوہر رفیع شاذ

محنت

بڑھیا نانی، بڑھیا نانی
ہم کو سناؤ، کوئی کہانی
چھوٹی بڑی یا لمبی کہانی
پر ہو اچھی، منی کہانی
بڑھیا نانی، بڑھیا نانی،
ہم کو سناؤ، کوئی کہانی

اس طرح لکّی ہمیشہ اپنی نانی سے کہانی کہنے اور سنانے کی ضد کیا کرتا تھا۔ کوئی اس کی بات ٹال بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ کافی دعاؤں اور منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس لیے دادیہال سے لے کر نانیہال تک سب اسے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ والہانہ پیار کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی شوخ اور ضدی ہو گیا تھا لیکن پڑھنے لکھنے میں کافی ہونہار اور ذہین تھا۔

کبھی کبھی وہ ایسی ایسی باتیں کہہ ڈالتا تھا کہ بڑے سے بڑے بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اس کی عمر سے زیادہ اس کا دماغ بڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ خدا کی یہ عجیب قدرت ہے کہ کسی بچے کا دماغ اس کی عمر کے ساتھ ساتھ آگے نہیں بڑھتا جس کی وجہ سے بڑا ہو کر بھی وہ بچوں جیسی باتیں کرتا ہے اور کوئی بچہ اتنا ایڈوانس ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑوں کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

چنانچہ جب لکی کے بار بار ضد کرنے پر بھی اس کی نانی جان اس کے معیار کے مطابق کوئی کہانی سنا نہیں پائیں تو اس کے چھوٹے نانا ایک بہترین اور سبق آموز کہانی اسے سنانے لگے۔ وہ دل تھام کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے کچھ اس طرح اپنی کہانی کا آغاز کیا۔

''نہرو ہائی اسکول کے طالب علم بالکل حروفِ تہجی کے حروف کی طرح الگ الگ ہوتے ہوئے بھی سب ایک تھے

لیکن حروف تہجی میں تو صرف پچاس ہی حروف ہوتے ہیں جب کہ وہ سیکڑوں میں تھے۔ دوسری ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بھی حروف تہجی کی دوقسموں 'مفرد' اور 'مرکب' کی طرح ہی دوحصوں میں بٹے تھے۔ پہلا حصہ تنہا رہ کر پڑھنے لکھنے اور اپنی محنت کے ذریعے اپنی زندگی سنوارنے میں یقین رکھتا تھا۔ اس حصے میں زیادہ تر غریب کے بچے تھے۔ جب کہ دوسرا حصہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل جل کر کھانے پینے اور کھیلنے کودنے میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ صرف کرتا تھا۔ اس گروپ میں زیادہ تر امیر کے بچے تھے۔ اس طرح لفظ یا کلمہ کی دوقسموں 'موضوع' اور 'مہمل' کی طرح ہی ان کی زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ یعنی پہلے گروپ کی زندگی معنی خیز تھی جب کہ دوسرے کی بے معنی!!"

"غالباً پہلے گروپ میں سب سے پہلا نام 'شاداب' کا آتا تھا۔ وہ کافی ذہین اور نہایت ہی شریف طالب علم تھا۔ وہ سائنس کی کتابوں کو اتنی بار پڑھتا تھا جب تک کہ پوری کتابیں ذہن نشیں نہ ہوجاتی تھیں۔ پھر وہ ان کتابوں کو اپنے کسی بھی ساتھی کو اس طرح پڑھا اور سمجھا دیتا تھا جیسے کہ کوئی ہندی یا تاریخ کی کتاب پڑھا رہا ہو۔ اس کی اسی لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے اسکول کے تمام اساتذۂ کرام اسے بہت مانتے اور پیار کرتے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب تو اکثر اسے اپنی پینٹ اور شرٹ پہننے کے لیے دیا کرتے تھے کیونکہ وہ بہت ہی غریب اور مجبور والدین کی اولادوں میں سے ایک تھا۔"

"بناوٹ کے اعتبار سے 'اسم' کی تین قسمیں 'جامد'، 'مصدر' اور 'مشتق' کی طرح نہیں یا 'جامد' کی دوقسمیں 'اسم معرفہ (اسم خاص) اور 'اسم نکرہ' (اسم عام) کی طرح اس کے تین یا دو بھائی نہیں تھے بلکہ 'اسم معرفہ' کی سات قسمیں: علم،

ضمیر، اسم اشارہ، اسم موصول، مضاف، معہود، اور منادی کی طرح ہی اس کے بھی سات بھائی تھے۔''

''کسی جملے کے 'فاعل' کی طرح وہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا اور اہم تھا۔ اس کے ابا حضور ایک معمولی کسان تھے۔ اس لیے بڑی مشکل سے اس کے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ ویسے تو کافی برسوں سے بڑے سے بڑے کسانوں کی بھی حالت خراب چل رہی ہے۔ پھر ایسے میں چھوٹے موٹے کسانوں کی پریشانی کے متعلق کچھ کہنا بے معنی سا لگتا ہے۔ آج کل تو اکثر اخبار یا نیوز چینل کے ذریعے یہاں کی تقریباً ہر ریاست سے ان کی خودکشی کی خبر آتی رہتی ہے۔ یہ ان کی حرماں نصیبی کا ہی نتیجہ ہے کہ صرف پچاس یا ساٹھ ہزار روپیہ کے لیے انھیں اپنی جان گنوانی پڑتی ہے، ورنہ بڑی بڑی کمپنیوں کی طرح وہ بھی اگر لاکھوں اور کروڑوں میں کھیلتے تو بینک کیا... کسی بھی سرکار کا ہاتھ ان کے گریباں تک نہیں پہنچ پاتا۔ یہ ہے غربت اور امارت میں فرق کا کمال!!''

''مگر یہاں تو ایک غریب کسان کے ہونہار اور ذہین بیٹے کو تعلیم حاصل کرنے اور کھانے پینے کے لیے بھی پیسے میسر نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی عنایت پر میٹرک کا امتحان دیا۔ اس امتحان میں اس نے نہ صرف اپنے اسکول کا نام روشن کیا بلکہ اپنے پورے ضلعے میں ٹاپ کیا۔

''پھر کسی طرح اس نے کالج میں داخلہ لیا۔ مگر ابھی وہ آئی۔ ایس۔ سی۔ کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ بہار سرکار کی طرف سے اساتذہ کی ویکنسی نکلی۔ وہ اس اگزام میں شامل ہوا اور صرف تنہا ہی نہیں بلکہ اپنے آس پاس کے تین چار ساتھیوں کے ساتھ کامیاب ہوا۔ اس کی مدد سے امتحان میں کامیاب ہونے والوں میں آج کئی ہیڈ ماسٹر کے عہدے تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن وہ خود کسی اسکول کا ٹیچر نہیں بنا تھا۔ اس نے اس اگزام کے بعد ہی ایک دوسرا اگزام بھی دیا تھا اور دونوں میں کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کی غربت کی وجہ سے چند حضرات نے اسے ماسٹری کے بجائے سرکاری امین بننے کی رائے دی تھی کیونکہ ماسٹری میں اوپری کمائی کچھ نہیں ہوتی جب کہ کوئی بھی کرمچاری یا سرکاری امین اوپر سے اپنی جیب خوب بھرتا ہے۔''

''اس طرح وہ دوسروں کی رائے سے سرکاری امین تو ضرور بن گیا مگر ایمانداری کا اس نے دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ اس کی سچی محنت اور لگن کے ذریعے چند سالوں میں ہی اس کے پورے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ ہمیشہ 'حرفِ عطف' یعنی دو لفظوں کو جوڑنے والے 'واؤ' کی طرح اپنے والدین اور اپنے بھائیوں کے درمیان تال میل بنائے رکھا۔ اس کی سچی محنت و مشقت کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کے تمام بھائی اپنی اپنی جگہ کامیاب ہو گئے اور والدین بھی آرام سے اپنی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔''

آج اس کی سچی محنت کی نشانی کے طور پر شہر کے اندر ایک خوبصورت مکان ہے اور 'جنس' کی دو قسموں 'مؤنث' اور 'مذکر' کی طرح اس کے بھی دو بچے 'شائستہ' اور 'شاہنواز' ہیں۔ اب آگے یہ دیکھنا ہے کہ وہ دورِ حاضر کے کچھ بچوں کی طرح 'محاورے'، 'استعارے' اور 'تلمیحات' و 'تشبیہات' میں الجھ کر صرف 'مقالہ نگاری' کرتے ہیں یا اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے 'اسم علم' کی پانچ قسموں: کنیت، عرف، لقب، تخلص اور 'خطاب' کی مانند اپنے نام کے ساتھ بھی کوئی نئی تاریخ رچتے ہیں۔

■

Gauhar Rafi Shaz
Kanchan Beauty Store, Janta Market
Saudagar Patti Road
Kishanganj - 855108 (Bihar)
Mob.: 9939591083

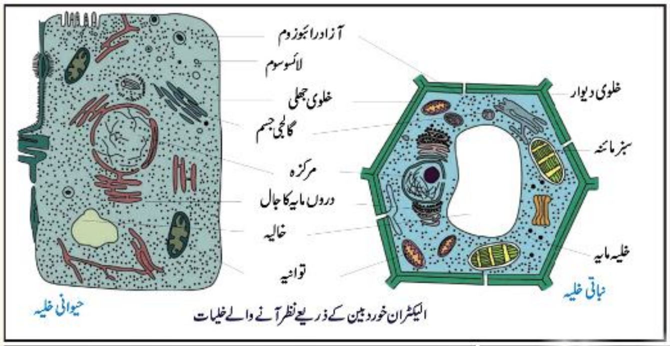

الیکٹران خوردبین کے ذریعے نظر آنے والے خلیات

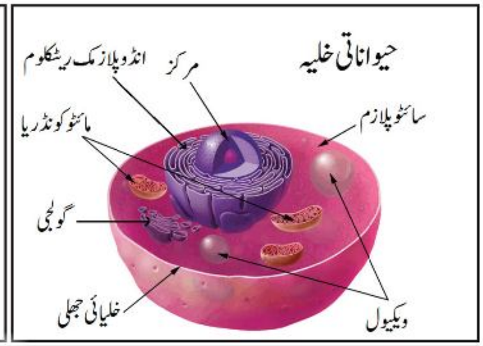

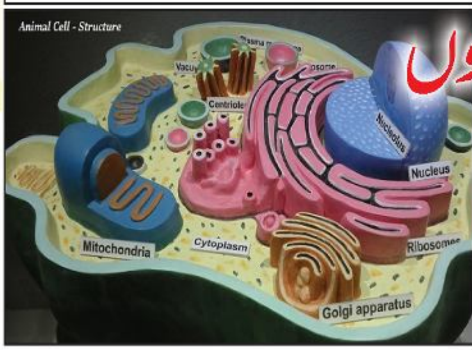

میں خلیہ ہوں

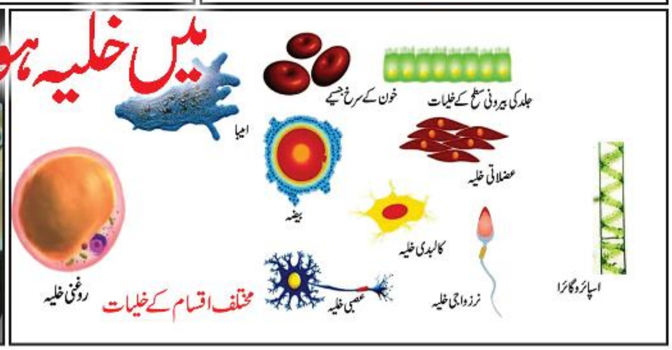

رفیع الدین ناصر

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کا تعلق اورنگ آباد مہاراشٹر سے ہے۔ وہ شعبۂ نباتیات مولانا آزاد کالج اورنگ آباد مہاراشٹر سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر وابستہ ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں سائنس پر 34 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ 285 سے زیادہ مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ انھیں تدریسی خدمات کے لیے نیشنل ایوارڈ مل چکا ہے۔ کئی کتابوں پر انعامات بھی مل چکے ہیں۔ انھوں نے گیارہویں اور بارہویں کے بچوں کے لیے سائنسی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں رہبر حیاتیات، تجرباتِ حیاتیات، علم حیاتیات قابل ذکر ہیں۔ بنیادی حیوانیات بھی ان کی اہم کتاب ہے۔

ننھے منے دوستو! آؤ آج میں آپ کو اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔ مجھے خلیہ یعنی 'سیل' (Cell) کہتے ہیں۔ آپ کو بتادوں کہ یہ نام سب سے پہلے مجھے رابرٹ ہک (Robert Hook) نے دیا تھا۔ میں آپ کے یعنی کسی بھی جاندار کی وہ بنیادی فعالی و ساختی اکائی ہوں جس کی وجہ سے کوئی بھی جاندار چاہے وہ انتہائی چھوٹا ہو یا بہت بڑا ہو اپنے سارے کام انجام دیتا ہے۔ میرے چھوٹے دوستو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جسم میں میری تعداد کتنی ہے؟ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ آپ کے ایک جسم میں میری تعداد 75 کھرب سے زیادہ ہے۔ اب آپ جان گئے ہوں گے کہ آپ کے جسم کی عمارت میرے ہی بلاک سے مل کر بنی ہے، اور میں ہی وہ بلاک ہوں جو آپ کے تمام افعال جیسے، نمو، تنفس، تغذیہ، اخراج و تولید انجام دیتا ہوں، اس لیے آپ کو میں اپنے بارے میں بتانے کے لیے آیا ہوں۔

دوستو! آپ کے ذہن میں سوال اٹھ رہا ہوگا کہ میں کیسا دکھائی دیتا ہوں؟ چلو بتادوں کہ میں آپ کے جسم میں گول یا

بیضوی شکل کا دکھائی دیتا ہوں جبکہ پودوں میں چوکون یا مخمس شکل کا دکھائی دیتا ہوں۔ البتہ بیکٹریا، وائرس، ایسٹ، امیبا وغیرہ میں میری شکل ان کے جسم کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ میں اتنا چھوٹا ہوتا ہوں کہ سادی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا، میرے مشاہدے کے لیے آپ کو طاقت ور خوردبین کا سہارا لینا ہوگا کیونکہ میرا سائز تقریباً سو مائکرو میٹر(ایک مائکرو میٹر مساوی 0.001 ملی میٹر) ہے۔

میرے بارے میں بے شمار تشبیہات دی جاتی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ میں ایک عجوبہ ہوں، ایک سائنس داں کہتا ہے کہ میں کیمیائی فیکٹری ہوں، تو دوسرا کہتا ہے کہ میں گنجان آبادی والا شہر ہوں، کوئی مجھے بڑی ریفائنری کہتا ہے۔ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ اگر آپ مجھے ایسا گھر سمجھ رہے ہیں جس میں میرا ہر ایک بلاک خودکار طریقے سے کام انجام دے رہا ہے تو غلط نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھے رہے ہیں میں گنجان آبادی والا شہر ہوں جس کا ہر ایک شہری خودکار طریقے سے تمام کام انجام دے رہا ہے تو بھی آپ صحیح سمجھے رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کو سمجھنے کے لیے آپ کو میرے ساتھ میرے اندر داخل ہوکر پورے اطمینان سے سیر کرنی چاہیے۔

اچھے دوستو! آپ میرے ساتھ میری سیر کو چلیے، سب سے پہلے میں آپ کو بتادوں کہ بنیادی طور سے میں ایک ہی نوعیت کا ہوتا ہوں، یعنی میرا جسم ایک دیوار سے گھرا ہوتا ہے، یہ دیوار اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح آپ کے گھر کی باؤنڈری وال کام کرتی ہے۔ یعنی میری حفاظت کے ساتھ ساتھ پڑوسیوں سے رابطہ رکھ کر مختلف اجزا کا تبادلہ کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اسی میں ایک گیٹ ہوتا ہے جس کو Plasmodesmeta کہتے ہیں، اس گیٹ کے ذریعے بین خلوی حمل ونقل ہوتا ہے۔ یہ بھی بتادوں کہ یہ دیوار لچکدار ہوتی ہے جو ایک مہین جھلی سے گھری ہوتی ہے۔ اب آپ اندر تشریف لائیے اور دیکھیے کہ میرا پورا گھر ایک جیل (Gel) نما مائع سے بھرا ہوا ہے اس خلوی مائع کو(Cytoplasm) کہتے ہیں جو کاربو ہائیڈریٹ، چربی، پروٹین وغیرہ سے مل کر بنا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس خلوی مائع میں میرے مختلف عضوچے (Organels) موجود ہیں، آیئے میں آپ کو ان سے ملاتا چلوں۔

سب سے پہلے ان سے ملیے یہ دائروی ہیئت والا جسم مرکزہ (Nucleus) ہے جو میرا کمانڈر ہے، یہ میری تمام سرگرمیوں پر قابو رکھتا ہے، مجھ میں موجود دیگر عضوچے کو ربط میں رکھ کر ہم آہنگ بناتا ہے۔ اس مرکزہ کے اندر بہت قیمتی سرمایہ ہوتا ہے جس کو DNA کہتے ہیں، یہ DNA زندگی کی چابی کہلاتا ہے جس کی وجہ سے نئے ذی حیات کا وجود ہوتا ہے، اس کے بارے میں تفصیل میں پھر کبھی آپ کو بتلاؤں گا۔ اس کے بازو یہ جو چپٹے جسے آپ دیکھ رہے ہیں اس کو رائبوزوم (Ribosome) کہتے ہیں۔ یہ پروٹین کی فیکٹریاں ہیں جو میرے افعال پر قابو رکھتی ہیں۔ اب تھوڑا آگے بڑھیے اور ان جھلی نما ساختوں سے ملیے یہ مرکزے سے جڑی رہتی ہے یہ دروں مائی جال(Endoplasmic Reticulum) کہلاتی ہیں۔ یہ پروٹین اور چکنائی تیار کرنے میں بڑا اہم کردار انجام دیتی ہیں۔ اب آگے آیئے اور مجھے آپ کو ان سے ملانے میں بڑا فخر محسوس ہوگا۔ یہ بیضوی شکل والے جناب توانیہ (Mitochondria) ہیں اور یہ جناب نہ صرف میرے لیے بلکہ پورے جسم کے لیے توانائی فراہم کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ پیارے بچو! جب آپ روزہ رکھتے ہیں اور اس کے بعد بھوکے پیٹ کام کرتے ہیں تو ایسی حالت میں آپ کو توانائی مہیا کرنے کا کام یہ مائٹیوکونڈریا انجام دیتا ہے۔ اب ذرا آگے

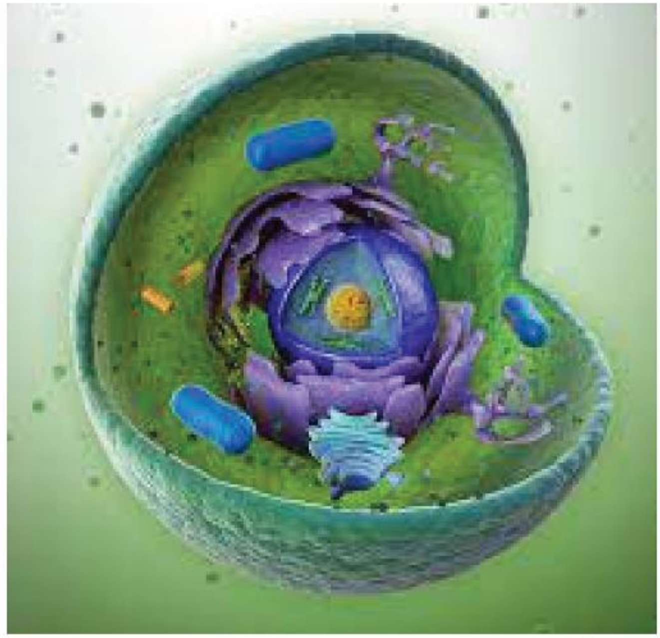

بڑھیے یہ جو خالی حصے آپ دیکھ رہے ہیں یہ خالیہ(Vacuoles) ہیں ان کو میرا ذخیرہ گھر کہتے ہیں۔ اب میں آپ کو اس بیضوی ساخت کی تھیلی سے ملاتا چلوں، اسے سبز مائنہ (Chloroplast) کہتے ہیں جو صرف پودوں میں ہی پائے جاتے ہیں اور شعاعی ترکیب (Photosynthesis) انجام دیتے ہیں جس سے ماحول کو آکسیجن ملتی ہے۔ میری سیر کرتے کرتے آپ تھک گئے ہوں گے۔ میں مختصراً بتاؤں دوں کہ میرے اندر اس کے علاوہ حسی ریزے (Plastids)، لائسوزومس، پرآکسی زومس وغیرہ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

ننھے منے دوستو! میں آپ کو یہ بتادوں کہ سائنسدانوں نے مجھے بنیادی طور سے دو اقسام میں تقسیم کیا ہے، میرے پہلے دوست کو پیش نواتی خلیہ (Prokaryotic Cell) کہتے ہیں، میرے اس دوست کی ساخت میں خلوی دیوار غیر ترقی یافتہ ہوتی ہے، مرکزہ اور مرکزوی جھلی (Nuclear Membrane) غیر موجود ہوتی ہے۔ مرکزہ برہنہ اور دائروی مرکزوی ترشے پر منحصر ہوتا ہے، میرا یہ دوست، بیکریا، ایسٹ یا یک خلوی ذی حیات (Unicllular Living Organism) میں پایا جاتا ہے۔ یہ خلوی ذی حیات کا پورا جسم ایک خلیہ پر مشتمل ہوتا ہے اور یہی ایک خلیہ تمام کام انجام دیتا ہے۔

سائنسدانوں نے میرے دوسرے دوست کا نام کامل نواتی خلیہ (Eukaryotic Cell) دیا ہے۔ میرا یہ دوست بہت ترقی یافتہ ہے کیونکہ اس میں اچھی بیرونی دیوار، نمایاں مرکزہ، خلوی مائع اور دیگر کئی عضوچے پائے جاتے ہیں، میرا یہ دوست کثیر خلوی ذی حیات (Multicellular Living Organism) جیسے بڑے پودوں، حیوانات وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے بغیر زندگی ناممکن ہے کیونکہ وہ میں ہی ہوں جو آپ کے جسم کو پڑھتا ہوں، اگر آپ کو زخم آجائے تو میں درست کرتا ہوں، آپ کو توانائی فراہم کرتا ہوں، آپ کے جسم سے گیسوں کا تبادلہ کرتا ہوں، آپ کی غذا کو ہضم کر کے فاضل مادوں کو خارج کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ آپ سے آپ ہی کی طرح ذی حیات پیدا کرتا ہوں اور آخر میں بے ترتیب ہو کر مر بھی جاتا ہوں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میرے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں تو پھر آپ کو خلیاتی حیاتیات (Cytology) کو پڑھنا ہوگا۔

■

Dr. Rafiuddin Naser
HOD Botany,
Maulana Azad College,
Aurangabad-431001 (Maharashtra)
Mob. : 9422211634.
Email : rafiuddinnaser@rediffmail.com

نشانِ راہ

حقانی القاسمی

ہر انسان کامیابی کے خواب دیکھتا ہے مگر خواب کی راہوں میں کبھی کبھی ایسی رکاوٹیں آجاتی ہیں کہ منزلیں کھو ہوجاتی ہیں۔

منزلوں کی گمشدگی کا غم بہتوں کو ہوتا ہے لیکن جوش، جذبہ، جنون، جستجو اور جدوجہد ہوتو ناکامیوں کو کامیابی میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بلب کے موجد ایڈیسن نے 999 بار کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ ہزارویں بار کی کوشش میں وہ بلب تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا کیونکہ اس کے اندر ایک عزم تھا، حوصلہ تھا، اس نے اس ناکامی کو بھی کامیابی کا زینہ بنایا، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کامیابی کا راستہ ناکامی کے پل سے ہوکر گزرتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان کے اندر کسی چیز کی سچی چاہت، شدید تمنا، خواہش ہو، اس کے اندر خوداعتمادی اور جذبہ عمل کے ساتھ، ناکامی کا خوف نہ ہوتو خوابوں کو صرف تعبیر نہیں بلکہ تعمیر بھی مل جاتی ہے۔ سچی گائیڈنس اور رہنمائی سے مشکل راہیں بھی آسان ہوجاتی ہیں۔ ایسی ہی رہنمائی کی ایک کتاب 'نشان راہ' ہے جس کے مصنف نقی احمد ندوی ہیں۔ انھوں نے طلبا کی کامیابی وترقی کے لیے ایک مفید لائحہ عمل اور روڈ میپ تیار کیا ہے۔ نقی احمد ندوی نے کامیابی کے بنیادی اصول، کامیابی کے شرائط، کیریئر، ناکامی کے اسباب ومحرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور میر تقی میر کے ایک شعر کے حوالے سے بہت اچھا پیغام دیا ہے کہ:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

جن لوگوں میں کچھ کرنے کا جنون ہوتا ہے وہ ہر طرح کی مشکلات اور چیلینجز کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ مصنف نے کامیاب اور ناکام آدمی کے اوصاف بھی بتائے ہیں۔ ان کی نظر میں کامیاب وہ ہوتا ہے جو اپنی منزل، مقصد اور مشن کا تعین کرلیتا ہے، جس کا طرزِ فکر مثبت ہوتا ہے اور جو منظم منصوبہ بندی کرتا ہے۔ انھوں نے منزل کے تعین کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور نپولین ہل کے حوالے سے لکھا ہے کہ اینڈریو کارنج ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنا ایک مقصد متعین کیا تھا اس لیے اسٹیل مل میں مزدور کی حیثیت سے کام کرنے والا وہ شخص اپنے ملک کا مالدار ترین آدمی بن گیا۔ نپولین ہل نے ایسی کامیاب شخصیتوں کے حوالے سے چار ضخیم جلدوں میں The Law of Success کے عنوان سے کتاب لکھی ہے، جس میں کامیاب ترین لوگوں کے انٹرویوز شامل ہیں اس کے علاوہ Think and Grow Rich کے نام سے ایک اور کتاب ہے کہ جس میں لکھا ہے کہ کامیابی کا پہلا اصول ہے 'مقصد کا تعین'۔ اس ذیل میں انھوں نے ویلما روڈولف کا بھی ذکر کیا ہے جو پولیو زدہ تھی مگر اپنے عزم، جذبے اور جنون کی وجہ سے اس معذور لڑکی نے اولمپکس میں تین ریسوں میں لگاتار جیت کر گولڈ مڈل حاصل کیا۔ نقی احمد ندوی نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ انسان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اگر جذبہ اور جوش ہوتو وہ ناممکن کو بھی ممکن کردکھاتا ہے۔ اس ذیل میں ہیلن کیلر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جس کی بصارت، سماعت گویائی سب کچھ چھن گئی تھی۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے بلند حوصلے سے اعلیٰ مقام حاصل کیا اور یہ ثابت کردکھایا کہ گونگے، بہرے اور اندھے لوگ بھی نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتے ہیں بلکہ کامیابی اور کامرانی کی نئی تاریخ بھی رقم کرسکتے ہیں۔ ندوی صاحب نے کامیابی کے لیے مثبت سوچ پر بھی زور دیا ہے کہ یہی سوچ انسان کی مشکل

راہوں کو آسان کرسکتی ہے جب کہ اس کے برعکس منفی سوچ کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے خوداعتمادی پر بھی زور دیا ہے کہ اس کے صحیح استعمال سے انسان کامیابی کی منزلیں بہ آسانی طے کرسکتا ہے۔ کامیابی کے لیے چاہت اور لگن بھی بہت ضروری ہے۔ کسی چیز کو پانے کی شدید خواہش ہی انسان کو بلندیوں تک پہنچاتی ہے۔ کامیابی کے لیے قربانی اور جانفشانی بھی لازمی ہے۔ انھوں نے اے پی جے عبدالکلام کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ''اگر تم سورج کی طرح چمکنا چاہتے ہو تو پہلے سورج کی طرح جلنا سیکھو۔'' اس حوالے سے میری کیوری کا حوالہ دیا ہے جن کی بے لوث محنت اور قربانی نے انسانی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے امر کردیا ہے۔ مستقل مزاجی اور استقامت بھی کامیابی کی ایک شرط ہے۔ جو لوگ ہمت ہار جاتے ہیں وہ کبھی منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ہمت اور حوصلے سے ہی خوابوں کی کشتی کو کنارے مل پاتے ہیں۔ انھوں نے کیریئر کے تعلق سے بھی قیمتی باتیں تحریر کی ہیں کہ انسان کو اپنے کیریئر کا انتخاب اپنے ذوق، صلاحیت اور لیاقت کے مطابق کرنا چاہیے۔ نقی احمد ندوی نے کامیابی کے علاوہ ناکامی کے اسباب ومحرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ جو Risk نہیں لے سکتے وہ لوگ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ اسی طرح جو شارٹ کٹ راستہ اختیار کرتے ہیں انھیں بھی ناکامی ہاتھ آتی ہے۔ جن کے اندر موقع شناسی کی صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے وہ لوگ بھی اکثر ناکام ہوجاتے ہیں۔ منصوبہ بندی کی عدم اہلیت بھی ناکامی کی ایک نشانی ہے۔ ڈسپلن کا فقدان بھی ناکامی جیسا بحران پیدا کرتا ہے۔ جیم رون نے بہت اچھی بات لکھی ہے کہ کامیابی اور مقصد کے درمیان جو پل ہے وہ ڈسپلن ہے۔ اس لیے ڈسپلن کے ساتھ اپنے مشن اور زندگی کے مقصد

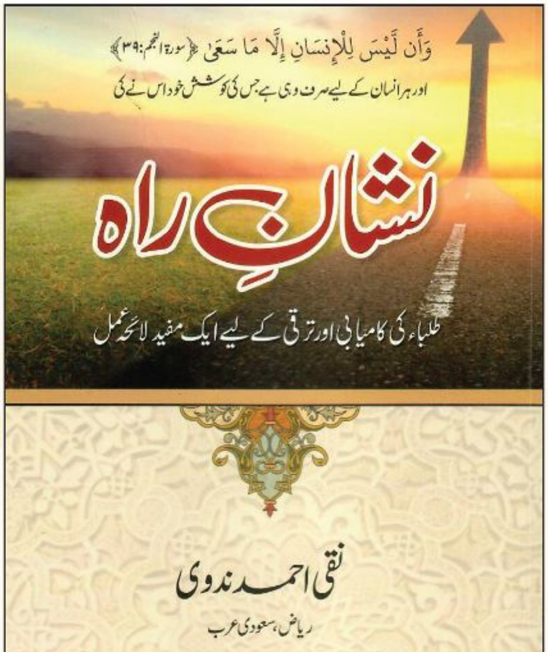

نشانِ راہ، مصنف: نقی احمد ندوی، صفحات: 232، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021، ناشر: مرزا ورلڈ بک ہاؤس، قیصر کالونی، اورنگ آباد۔ 431001 (مہاراشٹر)

کا تعین بہت ضروری ہے۔

'نشان راہ' میں جو کامیابی کے گر بتائے گئے ہیں ان پر عمل کرنے سے زندگی یقینی طور پر کامیابی کی شاہراہ پر دوڑنے لگے گی۔ نقی احمد ندوی کی یہ کتاب طلبا کے لیے نہایت مفید ہے اس کے علاوہ Rhonda Byrne کی موٹی ویشنل کتابیں ضرور پڑھنی چاہیے جن کے ترجمے اردو میں ہوچکے ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں کامیابی کا عظیم راز، ہیرو، پاور اور میجک ہیں۔ ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ 'کامیابی کا راز' کے عنوان سے ہے۔ اس طرح کی کتابیں اگر مطالعے کا حصہ بن جائیں تو یقینی طور پر طلبا زندگی کے ہر محاذ پر 'سنگ نشان' قائم کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

■

Haqqani Al Qasmi
B-145/ 8, Fourth Floor, Thokar No.: 8
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.: 9891726444

زبان شناسی

ہندوستانی مخزن المحاورات ایک ایسی کتاب ہے جس میں تقریباً 10 ہزار اردو اور ہندی کے محاورے اور اصطلاحات ہیں۔ دیہات وقصبات کے بھی محاورات اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ قدیم، نادرونایاب کتاب ہے۔ اس کے مصنف منشی چرنجی لال دہلوی ہیں جنھوں نے انگریز لغت نویس مسٹر فیلن کے محکمہ لغات میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام بھی کیا۔ لغت کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ہندوستانی زبان میں مخزن المحاورات جیسی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے اور جو کتابیں ہیں وہ بھی نامکمل ہیں اس لحاظ سے مخزن المحاورات طلبا کے لیے نہایت مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن منشی امیر چند نے مرتب کیا تھا۔ مخزن المحاورات Rekhth.org پر موجود ہے۔

چٹکی مارے لہو ٹپکتا ہے: محاورہ، بدن کی ایسی حالت ہورہی ہے کہ اگر اس میں ایک چٹکی لو تو خون ٹپکنے لگے۔ نہایت سرخ وسفید بنا ہوا ہے۔

چٹکیوں میں کام ہونا: اشارہ کے ساتھ کام پورا ہونا۔

چراغ پا ہونا: (1) گھوڑے کا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوجانا (2) اوندھا ہوجانا، پیٹھ کے بل گر پڑنا (3) خفا ہونا، چیں بہ جبیں ہونا۔

چرب زبانی کرنا: چکنی چپڑی باتیں بنانا، چاپلوسی یا خوشامد کرنا، للّو پتّو کرنا۔

چراغ سحری: قریب المرگ، جاں بلب

چشم بددور: تجھ کو کسی کی چشم بد کی نظر نہ لگے، تو چشم بد سے امن میں رہوے، تجھے کسی کی نظر نہ ہو۔

چشم پوشی کرنا: ٹال جانا، منہ پھیر لینا، درگزر کرنا، جانے دینا، طرح دے جانا۔

چشمک ہوجانا: ہلکی رنجش ہوجانا، شکررنجی ہوجانا۔

چکنی چپڑی باتیں کرنا: خوشامد وتملق کی باتیں کرنا، دھوکے یا کپٹ کی باتیں کرنا۔

چکی پیسنا: کسی کام کو عرصہ تک کیے جانا۔

چوٹ پر چوٹ: دھکے پر دھکا، صدمہ پر صدمہ، ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت، کیا کہوں چوٹ پر چوٹ لگتی جاتی ہے۔

چودھویں رات کا چاند: پورا چاند، پورنماسی کا چاند، نہایت خوبصورت اور حسین آدمی۔

چولی دامن کا ساتھ: (چولی اور دامن انگرکھے کے دو جزوں کا نام ہے جو ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے ہیں) اسی سبب سے، ہر وقت کا ساتھ یا میل ملاپ، قریب کی دوستی یا یگانگت، ہندو مسلمان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

چھاتی پیٹنا: کہرام مچانا، رونا، ماتم کرنا۔

چھٹی کا دودھ یاد آنا: کسی سخت یا محنت کے مقابلے میں اپنا بچپن یاد آجانا۔ جرأت ودلیری جاتی رہنا۔ گھبرا جانا۔ سٹی گم ہوجانا۔

چہرہ اتر جانا: اداسی چھانا، منہ زور ہوجانا۔

چھری کٹاری ہونا: چھری کٹاریوں سے لڑنا، لڑائی لڑنا، سخت یا جانی دشمنی ہونا

چہل قدمی کرنا: ٹہلنا، ہوا خوری کرنا، ہوا کھانا۔

چھکے چھوٹ جانا: پریشاں ہوجانا، ہوش وحواس جاتے رہنا، سٹی گم ہوجانا۔

چھلنی ہوجانا: (1) کسی چیز میں بہت سے سوراخ ہوجانا (2) بارش کے باعث جا بجا سے مکان کا ٹپکنا۔

چیں بجبیں ہونا: تیوری میں بل ڈال دینا، ترش رو ہونا، ناراض یا خفا ہوجانا۔

چہ میگوئیاں: نازوانداز کی باتیں، گپ شپ، نخرے تلے، شوخیاں۔

چھوٹے دل کا آدمی: بخیل، کنجوس، پست ہمت، کم حوصلہ۔

چھو ہوجانا: چل دینا، کافور ہوجانا، غائب ہوجانا، خرچ یا صرف میں آجانا

چھینٹ کی کوڑی: فالتو یا زائد دنوں کی اجرت۔

■

ماخذ: ہندوستانی مخزن المحاورات، **مولفہ:** منشی چرنجی لال صاحب مرحوم دہلوی، **ناشر:** امپریل بک ڈپو پریس، دہلی، **سنہ اشاعت:** 1899

سیاحتی مقامات

تاج محل کا شمار دنیا کی حسین ترین عمارتوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تشبیہ بجا طور پر ایک ایسے خواب سے دی گئی ہے جو سنگ مرمر میں ڈھلا ہے۔ اس کا بے مثال فنکارانہ کمال ہے کہ اتنی عظیم اور بلند عمارت ہونے کے باوجود اس میں حیرت انگیز لطافت ہے۔ یہ ملکہ نور جہاں کے بھائی آصف خان کی بیٹی ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل کا مقبرہ ہے۔ یہ ہندوستان میں صوبہ اتر پردیش کے ایک ضلع کے صدر مقام شہر آگرہ میں واقع ہے۔ اسے مغل شہنشاہ شاہجہاں نے اپنی محبوب کی یاد میں تعمیر کروایا تھا۔

ہوا محل گلابی شہر جے پور میں واقع ہے۔ یہ راجستھانی کلچر اور خوبصورتی کا حسین امتزاج ہے۔ اسے مہاراجہ سوائی پرتاپ سنگھ نے 1799 میں تعمیر کروایا تھا۔ اس کا ڈیزائن استاد لال چند نے تیار کیا تھا۔ ہوا محل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی پانچ منزلیں ہیں اور ہر منزل پر چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں جنھیں 'جھروکا' کہا جاتا ہے۔ اس میں نہایت ہی خوبصورت نقش و نگاری کی گئی ہے جس کی وجہ سے محل کے سارے سوراخ سے ہوائیں آتی رہتی ہیں۔ ہوا محل سرخ اور گلابی پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ اسی کی وجہ سے جے پور کو گلابی نگر بھی کہا جاتا ہے۔

گیٹ وے آف انڈیا ممبئی (مہاراشٹر) کا مشہور سیاحتی مرکز ہے۔ اسے ممبئی کا تاج محل بھی کہا جاتا ہے۔ 31 مارچ 1913 میں اس کا سنگ بنیاد اس وقت کے گورنر Sir George Sydenham Clarke نے رکھا تھا۔ اس کا آخری ڈیزائن مشہور آرکیٹیکٹ جارج وِٹیٹ کے ذریعے تیار کیا گیا تھا۔ شہنشاہ جارج پنجم کی آمد پر اسے تعمیر کروایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر 1924 میں مکمل ہوئی اور 4 دسمبر 1924 کو اس وقت کے وائس رائے Rufus Isaacs کے ذریعے عوام کے لیے کھولا گیا۔

عبدالمجید مکرو

بند گوبھی کے طبی فوائد

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

طبی ماہرین کی جانب سے متعدد بیماریوں سے بچاؤ اور دائمی صحت کے لیے پھلوں اور سبزیوں کا استعمال تجویز کیا جاتا ہے۔ قدرت نے چند سبزیوں میں کچھ ایسی خصوصیات رکھی ہیں جنھیں نظرانداز کرنا انسان کے لیے نقصان دہ ہے جب کہ ان کے استعمال میں صحت کے لیے بہت سے فائدے ہیں۔ طبی وغذائی ماہرین کی جانب سے ہمیشہ ہرے رنگ اور پتوں والی سبزیوں کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے۔ بند گوبھی کا شمار بھی ایسی ہی سبزیوں میں ہوتا ہے۔ اس سے متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں اور کئی بیماریوں سے بچاؤ ہوتا ہے۔ بند گوبھی کی افادیت پر کی جانے والی تحقیق کے مطابق بند گوبھی میں سلفر، بنیادی وٹامنز اور Minerals کی بھرپور مقدار پائی جاتی ہے جو کہ نہ صرف بیماریوں سے بچاؤ کو ممکن بناتی ہے بلکہ جسمانی قوت کے لیے بھی نہایت موزوں ہے۔

بند گوبھی غذائی اجزا سے بھرپور ہوتی ہے اس میں کیلوریز کی مقدار بہت کم جب کہ پروٹین فائبر (Protein Fiber) وٹامن کے، وٹامن سی، فولیٹ، وٹامن بی، کیلشیم اور پوٹاشیم کی مقدار بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس میں طاقتور اینٹی آکسیڈنٹ بھی پائے جاتے ہیں جو کہ انسانی صحت کے لیے

ناگزیر قرار دیے جاتے ہیں۔ یہ کم کیلوری اور صفر کولسٹرول ہونے کے سبب دل کی حفاظت کے لیے بہترین سبزی ہے۔

بندگوبھی پکا کر کھانے کے بجائے زیادہ تر بطور سلاد استعمال کی جاتی ہے اور یہی اس کے استعمال کا صحیح طریقہ بھی ہے۔ بند گوبھی سے بنا رائتہ بھی نہایت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ بند گوبھی سے صحت کو حاصل ہونے والے بے شمار فوائد میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

کینسر سے بچاؤ میں معاون: تہہ در تہہ پتوں پر مشتمل بند گوبھی کے باقاعدہ استعمال سے کینسر سے بچاؤ ممکن ہوتا ہے۔ اس میں شامل لیوپیول، سنگرین اور سلفر جیسے اجزا کینسر کا سبب بننے والے ٹیومر کی نشوونما کو روک دیتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق چھاتی کے کینسر کی شکار خواتین کی خوراک میں بند گوبھی کا خصوصاً استعمال کرنا سودمند ثابت ہوتا ہے۔

وزن میں کمی کا سبب: بند گوبھی ڈائٹنگ کرنے والے افراد کے لیے نہایت مفید غذا ہے۔ یہ بغیر کولسٹرول اور کم کیلوریز کے سبب وزن گھٹانے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ ایک کپ پکی ہوئی بند گوبھی میں صرف 33 کیلوریز جب کہ کچی بند گوبھی میں اس سے بھی کم کیلوریز پائی جاتی ہیں۔ اس سبزی میں چکنائی کی مقدار انتہائی کم جب کہ فائبر کی مقدار اچھی خاصی پائی جاتی ہے جو کہ وزن گھٹانے کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔

دماغی نشو و نما کے لیے بہترین غذا: بند گوبھی میں وٹامن کے اور اینتھوکینین نامی جز پایا جاتا ہے جو ذہنی صحت اور اس کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مدد کرتا ہے۔ بند گوبھی اعصابی نظام کو تھکنے اور تباہ ہونے سے بچانے کے علاوہ الزائمر کے خلاف قوت مدافعت بڑھاتی ہے۔

صحت مند جلدکی ضامن: بند گوبھی میں سلفر بھرپور مقدار میں پایا جاتا ہے۔ بند گوبھی کا استعمال چکنی جلد سے اضافی چکناہٹ اور دانوں کو ختم کردیتا ہے۔ سلفر بالوں، ناخنوں اور جلد کی صحت کے لیے بھی نہایت مفید قرار دی جاتی ہے۔

طبی ماہرین کے مطابق بند گوبھی میں موجود وٹامن سی (Vitamin C) سلفیورک ایسڈ (Salphuric Acid) سے بھی بچاتا ہے۔

بلڈ پریشر (Blood Pressure) متوازن سطح پر رکھتی ہے: بند گوبھی کا استعمال ہائی بلڈ پریشر کو متوازن سطح پر رکھتا ہے۔ اکثر اوقات طبی ماہرین کی جانب سے ہائی بلڈ پریشر کے مریضوں کو بند گوبھی بطور سلاد کھانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

قبض (Constipatin) سے نجات: بند گوبھی میں موجود بڑی مقدار میں فائبر اور پانی قبض سے نجات دلاتا اور نظام ہاضمہ کو صحت مند بناتا ہے۔ ■

Abdul Majeed Makrow
Arwani Kulgam
Anantnag - 192124 (J&K)

کہکشاں

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر وتقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔
'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر وتقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

— قائم چاند پوری

ڈرتا ہوں محبت میں مرا نام نہ ہووے
دنیا میں الٰہی کوئی بدنام نہ ہووے

— اشرف علی فغاں

یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ
بلا سے پھاڑ کے پھر ہاتھ میں نہ لے کاغذ

— میاں احسن اللہ خاں

گئے جہان سے جو لوگ دو جہاں سے گئے
کسی نے پھر نہ کبھی اپنا کارواں دیکھا

— مرزا رضا برق

یہ لوگ کیوں مرے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
انھیں تو دیکھیں ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

— محمد ابراہیم ذوق

سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم
مجھے یہ ساری دنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

— تلوک چند محروم

پھول بننے کی خوشی میں مسکرائی تھی کلی
کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام ہے

— سراج لکھنوی

وہی کارواں، وہی راستے، وہی زندگی، وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

— شکیل بدایونی

مانا کہ اس جہاں کو نہ گلزار کرسکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

— ساحر لدھیانوی

میں جس کے ہاتھ میں اک پھول دے کے آیا تھا
اسی کے ہاتھ کا پتھر مری تلاش میں ہے

— کرشن بہاری نور

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

— احمد فراز

دل پاگل ہے روز نئی نادانی کرتا ہے
آگ میں آگ ملاتا ہے پھر پانی کرتا ہے

— افتخار عارف

ام ایمن حسیب عالم

انتظار ہے اسکول کھلنے کا

پچھلے ڈیڑھ سال سے ہم سب اپنے گھروں میں ہی ہیں۔ یا اللہ! یہ کیسے دن آ گئے۔ سب دور دور رہتے ہیں، کوئی بھی پاس پاس نظر نہیں آتا۔ ابو کہتے ہیں، یہاں نہ جاؤ، وہاں نہ جاؤ، باہر نہ نکلو، گھر میں ہی کھیلو، بار بار صابن سے منہ ہاتھ دھولو، سینی ٹائزر ہاتھ پر ڈالو، ایسے کئی آرڈر ہمیں دیے جاتے ہیں۔ گھر کے سبھی لوگ ڈرے ڈرے سے نظر آتے ہیں۔ پہلے پہلے تو ہم نے کچھ نہ سمجھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کورونا کی وجہ سے یہ ساری پابندیاں ہم پر لگائی جا رہی ہیں۔ ہم نے ابو سے پوچھا ''کیا ہے یہ کورونا؟ کون رو رہا ہے؟ کیوں رو رہا ہے؟ چلیے اسے مناتے ہیں اور سمجھاتے ہیں'' تو اس پر ابو نے کہا ''او گڑیا، عقل کی پڑیا! یہ کورونا کوئی انسان نہیں بلکہ وائرس ہے، خطرناک وائرس جو ہمیں نظر نہیں آتا۔''

ابو کا یہ جملہ سن کر ہم مسکرا دیے اور بولے ''ابو جان وائرس تو تھری ایڈیٹ میں بھی تھا۔ وہ تو دکھائی دیتا ہے۔ یہ کیسا وائرس ہے نظر بھی نہیں آتا اور انسانوں کو مارتا ہے۔ ابو نے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر ہم نے ان کا سر دبانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ابو نے بڑی تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ تب بات سمجھ میں آئی کہ اس وائرس نے تو پوری دنیا کو ڈرا رکھا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے خوف سے بڑے بڑے پہلوان بھی اپنے گھروں میں جا چھپے۔

مجھے سب سے زیادہ تکلیف اس بات کی ہے کہ کووڈ نے ہم سے ہمارے کئی رشتے داروں اور پڑوسیوں کو ہم سے چھین لیا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے اسکول اب تک بند بھی ہیں۔ مجھے اپنے اسکول کی یاد ستا رہی ہے۔ استاد اور استانیاں یاد آ رہی ہیں۔ آن لائن تدریس تو جاری ہے مگر یہ بھی کوئی پڑھائی ہے۔ سچ پوچھیے تو اس سے سر درد ہونے لگتا ہے اور اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اسکول میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیلتے بھی تھے اور شرارتیں بھی کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں بہت یاد آتی ہیں۔

میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ ہمارے کھیلنے کودنے کے دن لوٹ آئیں، شرارتوں اور شکایتوں کے دن واپس آ جائیں۔ اللہ سے یہ بھی دعا ہے کہ وہ کورونا کو پوری دنیا سے دور کر دے۔ اے اللہ ہماری غلطیوں کو معاف کر دے اور ہمیں اپنے پرانے دن لوٹا دے آمین ثم آمین!

■

Umme Aiman Haseeb Alam
Std 6th
KK Urdu Girls High School
Jalgaon- 425001 (Maharashtra)

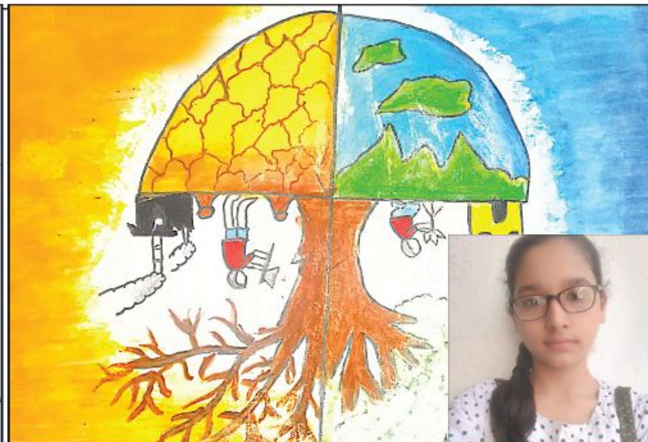

زونیرہ خان، درجہ نہم، نماڑ ویلی انٹرنیشنل اسکول برہانپور، مدھیہ پردیش

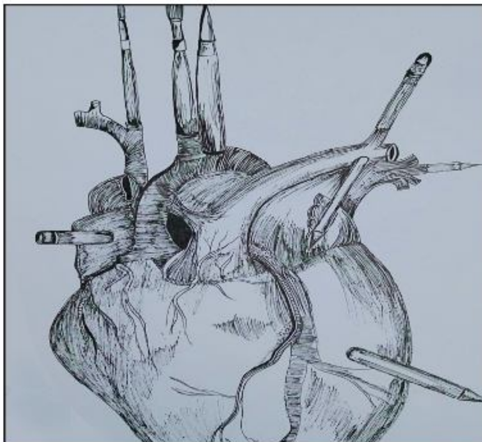

غزالہ نجم الہرا، درجہ یازدہم، جامعہ گرلس سینئر سیکنڈری اسکول، نئی دہلی

انجلا مہروش تسلیم، درجہ پنجم
براٹ میموریکل اسکول، کولکاتا، مغربی بنگال

مریم عابد خان، درجہ دوم، الفلاح پبلک اسکول، مالیرکوٹلہ، پنجاب

عنایا فاطمہ، درجہ دوم، اسکالر انگلش اسکول
کرکٹ گیٹ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

عنایا عمران، درجہ پنجم، دی ٹاؤن اسکول، مالیرکوٹلہ، پنجاب

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

बच्चों की दुनिया मासिक, नवंबर 2021, वर्ष 9, अंक 11
BACHON KI DUNIYA Monthly, November 2021 Vol. 11, Issue: 09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2019-21
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/10/2021
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات:16، قیمت:20 روپے

صفحات:64، قیمت:24 روپے

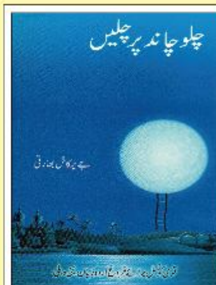

صفحات:48، قیمت:16 روپے

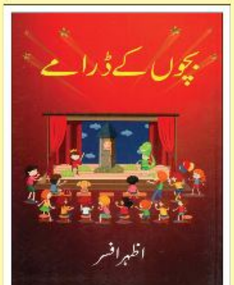

صفحات:24، قیمت:30 روپے

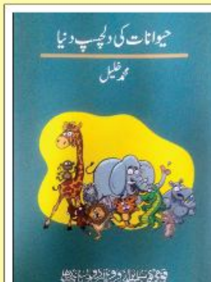

صفحات:83، قیمت:24 روپے

صفحات:64، قیمت:20 روپے

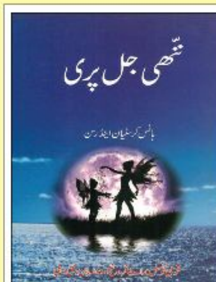

صفحات:33، قیمت:15 روپے

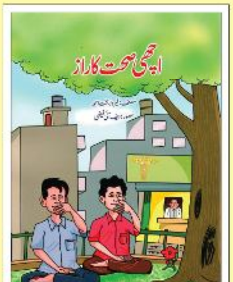

صفحات:16، قیمت:20 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6